زبان اور سماج: مستنصر حسین تارڑ کے ناول قلعہ جنگی میں سیاسی کلامیے کا تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے ایم فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد عرفان

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲

زبان اور سماج: مستنصر حسین تارڑ کے ناول قلعہ جنگی میں سیاسی کلامیے کا تنقیدی جائزہ

Language and Society: Critical Discourse Analysis of Qila Jangi in Political Perspective

مقالہ نگار:

محمد عرفان

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

فیکلٹی لینگویجز

(اردو زبان وادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ ہم مجموعی طور پر ان کی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: زبان اور سماج: مستنصر حسین تارڑ کے ناول قلعہ جنگی میں سیاسی کلامیے کا تنقیدی جائزہ

پیش کار: **محمد عرفان** رجسٹریشن نمبر: 20Mphil/Urdu/F20

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ اردو زبان و ادب

پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر سید نادر علی ____________________

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: ______________

اقرار نامہ

میں محمد عرفان حلفاً بیان کرتا ہوں کہ زیر نظر مقالہ بعنوان ”زبان اور سماج: مستنصر حسین تارڑ کے ناول قلعہ جنگی میں سیاسی کلامیے کا تنقیدی جائزہ“ کے سلسلے میں کی گئی تحقیق میری ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس مقالہ کو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل کے سکالر کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ کسی دوسرے ادارے یا یونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا گیا اور نہ ہی آئندہ کہیں اور پیش کیا جائے گا۔

میں اس مقالہ کے جملہ نتائج تحقیق کا ذمہ دار ہوں۔ غلط بیانی کی صورت میں یونیورسٹی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ انضباطی کاروائی کر سکتی ہے۔

محمد عرفان

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲

فہرست ابواب

Abstract

Every society and its civilization are shaped by language. In today's world, strong powers utilize language as a tool to subjugate weak states. In this context, numerous discourses are emerging, through which any community can achieve the desired improvements. Pakistan and Afghanistan continued to exist in distinct discourses that had been constructed through language at the end of the Russia-US cold war. These discourses, which the international community labeled as terrorism at times and jihad at others, had a profound impact on Pakistani and Afghani society. In Jihadi discourse, such literature is published in the name of Islam even though it has nothing to do with Islam, whereas literature that combines Islam and terrorism on false pretenses is produced after the international community's interests have been changed. In this Thesis, the problem has been examined in the context of Mustansar Hussain Tarar's novel "Qila Jangi". The fundamental discussions surrounding discourse have been covered in detail in the first chapter of this study, which also includes discourse analysis by Michael Fuko and theory-critical discourse analysis by Norman Fairman. The second chapter critically examines how Jihadi literature has affected Pakistani and Afghani society. In

the third chapter post, 9/11 discourse related to terrorism has been critically analyzed in the context of the "Qila Jangi" novel by Mustansar Hussain Tarar other than "Qila Jangi". Conclusions, results, and recommendations are included in the last chapter.

اظہارِ تشکر

انسان پیدائش سے لے کر موت تک، اپنی ذات کی بابت، اپنے سماج اور اس کائنات کی بابت رسمی اور غیر رسمی طریقوں سے علم حاصل کرتا ہے اور یہ اس کا فکری و شعوری سفر کہلاتا ہے۔ کسی بھی انسان کے لیے اس کی زندگی کے فکری سفر کا سب سے بہترین لمحہ وہ ہوتا ہے جب وہ اس کائنات اور سماج کی بابت کسی مستند ادارے سے قابل اور محنتی اساتذہ کی زیرِ نگرانی اپنا زاویہ نظر پیش کرتا ہے۔ میں اپنی زندگی کے اس اہم موڑ پر سب سے پہلے اپنی امی اور ابو کا شکر گزار ہوں کہ انہوں میری اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنی پوری زندگی صرف کر دی اور ہمیشہ ان کی محبت اور دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ اس کے بعد میں اپنے بڑے بھائی علی رحمٰن بلوچ کا دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں بڑے بھائی ہونے کے ناطے نہ صرف میرے تمام تعلیمی اخراجات پورے کیے بلکہ میرے لیے پردیس میں بھی آسانیاں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم کے لیے ساز گار ماحول فراہم کیا، جس کی وجہ سے میں نے فکرِ روزگار سے آزاد ہو کر اپنی پوری توجہ تعلیم کے حصول پر صرف کی۔ میں ان کی شفقتوں اور محبتوں کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

میں اپنے فکری سفر کے اس مرحلے کی تکمیل پر ان تمام اساتذہ، دوست احباب اور اپنی فیملی کا شکر گزار ہوں جنہوں کسی نہ کسی طرح میری شعور میں اضافہ کیا جس کی بدولت میں آج اس مقام تک پہنچ سکا۔ اس کے علاوہ میں بطور خاص اپنی شفیق اور قابل استاد پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم کا شکر گزار ہوں، جن کی زیرِ نگرانی میں نے یہ تحقیقی مقالہ مکمل کیا اور انہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر تحقیقی مقالے کی تکمیل تک، ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ اس سلسے میں، میں ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر نازیہ یونس اور ڈاکٹر بشریٰ پروین کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں مجھے ہمیشہ شفقت، محبت اور حوصلہ دیا۔ میں ڈاکٹر صائمہ نذیر اور ڈاکٹر صنوبر الطاف کا بھی انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے تحقیقی مقالے کی تکمیل تک میری رہنمائی کی اور ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا۔

میں وفاقی اردو یونیورسٹی کے اساتذہ کرام کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں میری ابتدائی و بنیادی فکری تہذیب کے ساتھ ساتھ میری اخلاقی تربیت کی۔ میں اس سلسلے میں ڈاکٹر ناہید قمر کا بے حد شکر گزار ہوں

جنہوں اس فکری سفر میں میری ہر قدم پر رہنمائی فرمائی۔ زیرِ نظر تحقیق میں بھی انہوں میرے فکری ابہام دور کیے اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں نوازا۔ میں ڈاکٹر سید عون ساجد نقوی کا بھی دل سے شکر گزار ہوں جنہوں میں میری فکری تربیت کی اور مجھ میں علمی تحرک پیدا کیا اور میں فکری طور پر آج جس مقام پر کھڑا ہوں انہی کے مرہون منت ہے۔

میں اپنے کالج اسلام آباد ماڈل کالج ایف ٹین فور کے اپنے تمام کولیگز کا شکر گزار ہوں جنہوں اس تحقیق کے دوران میرے لیے آسانیاں پیدا فرمائیں۔ میں اپنے کالج کے صدر شعبہ اردو، جناب بابر خان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں دوران تحقیق میرے لیے ہر ممکن مدد کی اور مجھے تحقیقی مقالے کے سلسلے میں جب بھی کالج سے چھٹی درکار ہوتی، بنا کسی تامل کے جانے کی اجازت دیتے۔ میں ان کی اس مہربانی کا ہمیشہ مقروض رہوں گا۔ اس کے علاوہ میں ڈاکٹر شیر علی، سر مظفر حسین، سر ساجد اقبال، ڈاکٹر جابر حسین اور سر صہیب احمد کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں دوران تحقیقی میری رہنمائی کی۔ میں اپنے وائس پرنسپل پروفیسر راشد سلیم کا بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس تحقیقی سفر کے دوران، موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک میری رہنمائی فرمائی اور اس مشکل سفر کو آسان بنانا۔

اس تحقیقی مقالے دوران میں ان دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے دورانِ تحقیق تمام مشکلات میں میرا ساتھ دیا۔ میں احمد بلال بلوچ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے تحقیق مقالے کے لیے تمام ضروری کتب مجھے بطور تحفہ پیش کیں۔ اپنی ہم جماعت ارشمہ کرن کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں اس تحقیق کے دوران ہر موڑ پر میری مدد کی۔ میں اپنے دوست محمد احسان حسن کا بھی شکر گزار ہوں جو اس تحقیقی مقالے کے لیے مواد کے حصول سے لے کر کمپوزنگ تک، ہر وقت مجھ پر مہربان رہے۔ اس کے علاوہ میں اپنی دوست خدیجۃ الکبریٰ کا بھی دل سے شکر گزار ہوں جس نے میرے اس علمی سفر میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا۔ اس کے علاوہ میں اپنے دوست وقار احمد، ارسلان اسلم عاصی، اعتزاز احسن، مولوی اسامہ یوسف اور اسامہ خواجہ کا دل سے شکر گزار ہوں جن کی سنگت نے اس تحقیقی کام کو آسان بنایا۔ عزیزم علی زین کا بے پناہ شکریہ، جنہوں نے دوران تحقیق طویل مطالعے کے دوران میری چائے اور کافی سے انرجی بحال رکھی اور مجھے فلیٹ

کی تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ کیا، جس کی وجہ سے میں زیادہ سے زیادہ وقت اپنے تحقیقی مقالے کے لیے صرف کر سکا۔

ان سب کے علاوہ میں ڈاکٹر روش ندیم کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس تحقیقی مقالے کے دوران میری ہر ممکن رہنمائی فرمائی۔ پروفیسر ادریس آزاد جیسے مہربان اور شفیق استاد کا بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک میری رہنمائی کی اور مجھے اس تحقیق کے دوران جب بھی ان کی ضرورت پڑی پروفیسر صاحب نے فوراً میری بات سنی اور مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔ جناب نجیب آغا (کوئٹہ) کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے ایک فون کال پر تمام ضروری مواد مہیا کیا اور تحقیق کے دوران میری ہر سطح پر ہنمائی فرمائی۔

میں ان تمام عزیزان کے تعاون اور محبت کا بے حد شکر گزار ہوں۔ دعا ہے خداوند بزرگ و برتر ان کے لیے زندگی کے ہر مرحلے پر آسانیاں پیدا فرمائے اور انہیں ہمیشہ سرخرو رکھے۔ آمین۔

عرفان بلوچ

سکالر ایم فل (اردو)

باب اول: تعارف اور بنیادی مباحث

موضوع کا تعارف (Introduction)

مشل فوکو بیسویں صدی کا ایک فرانسیسی فلسفی اور ماہر لسانیات ہے۔ جس نے اپنے مخصوص نظریہ، ''فوکالڈین ڈسکورس اینالسس'' کی وجہ سے غیر معمولی شہرت حاصل کی اور انسانوں کے واحد مواصلاتی رابطے یعنی زبان کو گرامر اور منطقِ محض کی حدود سے نکال کر سماجی، نفسیاتی سائنس کی ڈومین کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ دیا۔

ہم اپنی برتری قائم رکھنے کیلیئے زبان کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ کسی بھی نظریے، بیانیے اور ڈسکورس کو مسلط کرنے اور اسے بر قرار رکھنے کیلیئے زبان کو بطور آلہ (Tool) استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اگر ہم افغانستان کی بات کریں تو سویت یونین کے خلاف لڑنے والے افغان جنگجو مجاہدین کہلاتے ہیں جبکہ وہی جنگجو جب امریکہ کے خلاف لڑتے ہیں تو دہشت گرد کہلاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟

اس سوال کے جواب سے پہلے چند بنیادی باتیں ہیں جن کا علم ضروری ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اپنی مرضی کے بیانیے ترتیب دیتی ہیں اور پھر انہیں پوری دنیا میں میں زبا ن (تحریر اور گفتگو) کے ذریعے رواج دیا جاتا ہے اور اس طرح کے ڈسکورس کو رائج کرنے کے بعد زبان کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے ہوئے اس کے مطابق لٹریچر بار بار (Repeatedly) لکھا جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''قلعہ جنگی'' افغانستان میں بدلنے والے اس سیاسی ڈسکورس کی بہترین مثال ہے۔ جس کے مطالعہ سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ایک ڈسکورس کے اندر رہنے والے لوگوں کی سوچ اور ان کے عمل کو کیسے زبان کے ذریعے ہائی جیک کیا جاتا ہے۔ اس تحقیق کو مستنصر حسین تارڑ کے ناول " قلعہ جنگی " کے تناظر میں افغان سماج کے جائزے تک محدود رکھا گیا ہے۔

بیان مسئلہ:(Thesis Statement)

جب ہم کسی ڈسکورس کا حصہ بنتے ہیں تو ہم خود سے سوچنے کی صلاحیت سے قدرے محروم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم اس ڈسکورس سے باہر دیکھنے کی سہولت گنوا چکے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم اس ڈسکورس کے ذریعے پھیلائے گئے جھوٹ کو سچ مانتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس تر حقیق کے سلسلے میں بنیادی سوال اور مسئلہ یہ ہے کہ ڈسکورس

کیسے وجود پاتے ہیں اور ان کے اطلاق کیلئے کون سے طریقہ کار عمل میں لائے جاتے ہیں اور یہ معاشرے پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔

مقاصد تحقیق:(Research Objectives)

اس تحقیق میں مندرجہ ذیل مقاصد پیش نظر ہیں:

1. کسی بھی معاشرے میں پنپنے والے ڈسکورس کے پس پردہ مقاصد کی کھوج لگانا
2. ناول قلعہ جنگی میں دو متضاد ڈسکورسز کا تنقیدی جائزہ لینا
3. افغانستان کے متعلق تخلیق کردہ عالمی ڈسکورس کا ہماری سوسائٹی پر اثرات کا جائزہ لینا

تحقیقی سوالات:(Research Questions)

مجوزہ تحقیق کے دوران مندرجہ ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے گئے ہیں:

1. جدید دنیا میں زبان کو بطور ہتھیار کیسے استعمال کیا جاتا ہے؟
2. قلعہ جنگی میں دکھائے گئے افغانستان میں زبان کو بطور سیاسی ہتھیار کیسے استعمال کیا گیا؟
3. افغانستان کے متعلق بنائے گئے ڈسکورسز کا اپنے زیر اثر سماج پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

نظری دائرہ کار:(Theoretical Framework)

اس تحقیق کو تنقیدی تجزیہ کلامیہ (Critical Discourse Analysis) کے ذریعے پرکھا گیا ہے۔ یہ نظریہ نورمین فیئر کلف (Norman Fairclough) نے 1995 میں پیش کیا۔

مشل فوکو نے 1969 میں اپنی کتاب دا آرکیالوجی آف نالج (The Archaeology of Knowledge) میں بڑی وضاحت کے ساتھ کلامیہ (Discourse) پر لکھا ہے۔ مشل فوکو اس کتاب کی ابتدا ہی میں یہ بات واضح کرتا ہے کہ کسی بھی ڈسکورس کے قائم کرنے کیلئے سب سے پہلے اس ڈسکورس کے بارے علم ہونا چاہیے، اس کے بعد اس علم کو شائع کیا جائے، اس کے پروفیسرز ہوں اس کے نقاد ہوں اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والے لوگ ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ان سب لوگوں کا کسی نہ کسی طاقت کے مرکز کے ساتھ تعلق ہو، اور پھر ان لوگوں کے پاس اتنی طاقت ہو کہ جب وہ اپنے مخصوص ڈسکورس کے بارے میں کوئی رائے دیں تو اسے حتمی اور سائنسی سمجھا جائے۔ اس کے بعد ڈسکورس اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ مشل فوکو

ڈسکورس کے بارے یہ کہتا ہے کہ اس کا اثر مادی ہوتا ہے۔یعنی ڈسکورس نہ صرف انسان کی فکر میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے بلکہ وہ اس کی عملی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ہم یہ بات قلعہ جنگی ناول میں دکھائے گئے افغان سماج اور اس کے بارے دنیا کے قائم کردہ ڈسکورس سے جان سکتے ہیں۔

مشل فوکو کا ڈسکورس انالسز دراصل مجموعی طور زبان کے تمام لسانی پہلوؤں کو دیکھتا ہے۔ جس میں وہ معاشرتی سطح پر زبان کے سماجی استعمال کی وجہ سے ہونے والی تبدیلیوں کا مجموعی جائزہ لیتا ہے۔ دوسری بات مشل فوکو کا ڈسکورس انالسز تحریر کو اس کے باہر جا کر دیکھنے کی ابتدائی کوشش ہے۔دوسری جنگ عظیم کے بعد جہاں مابعد جدیدیت شروع ہوتی ہے وہاں مشل فوکو کی تھیوری میں بھی مابعد جدیدیت کے بہت سارے عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ جس کو بعد میں نارمین فیئر کلف نے کریٹیکل ڈسکورس انالسز کے نام سے متعارف کروایا۔اس کے علاوہ نارمین فیئر کلف(Norman Fairclough)کا سہ جہتی ماڈل (Three Dimensional module) زبان کے لسانی پہلوؤں کے سماجی سطح پر اس کے سیاسی استعمال کا تنقیدی تجزیہ پیش کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول چونکہ افغانستان کے سیاسی بحران کے تناظر میں لکھا گیا ہے،اس لیے یہاں مشل فوکو کی تھیوری سے بطور پسِ منظری مطالعہ استفادہ کیا گیا۔ جبکہ نارمین فیئر کلف(Norman Fairclough)کی تھیوری کا اطلاق کرتے ہوئے ناول ''قلعہ جنگی'' میں موجود سیاسی ڈسکورس کا تنقیدہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

تنقیدی تجزیہ کلامیہ(Critical Discourse Analysis) کی تھیوری برطانوی نقاد نارمین فیئر کلف (Norman Fairclough)نے اپنی کتاب کریٹیکل ڈسکورس انالسز (Critical Discourse Analysis) میں پیش کی ہے۔ جس میں اس نے زبان کو سیاسی سطح پر سماج کے ساتھ جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ کریٹیکل ڈسکورس انالسز کو نارمین فیئر کلف(Norman Fairclough)کا سہ جہتی ماڈل (Three Dimensional module) بھی کہتے ہیں۔ جس میں فیئر کلف کسی بھی کلامیے کو تین طرح کے تناظر میں پرکھنے کا نظریہ دیتا ہے۔ جس میں تحریر، اس کے بعد اس کے پیداواری ذرائع(Production and Consumption Of Text)، کو دیکھا جاتا ہے اس کے بعد اس کی سماجی سرگرمیاں (Social Practice)شامل ہیں۔

اس نظریے کے تحت یہ تحقیق مستنصر حسین تارڑ کے ناول قلعہ جنگی کو سامنے رکھتے ہوئے افغانستان کے متعلق دوبار بدلنے والے ڈسکورس کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور ان ڈسکورسز کے پس پردہ چھپے مقاصد کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس تحقیق کا ڈھانچہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ہے:

1. کلامیہ کی تفہیم
2. کلامیہ کے تنقیدی جائزہ کی تفہیم
3. قلعہ جنگی کے تناظر میں کلامیہ کے اطلاق کا تنقیدی جائزہ
4. ماحصل، نتائج اور سفارشات کا بیان

تحقیقی طریقہ کار:(Research Methodology)

تحقیق کا موضوع چونکہ زبان اور سماج کے رشتے کے تنقیدی تجزیے پر مشتمل ہے اور اس حوالے سے قلعہ جنگی میں موجود زبان اور سماج کے سیاسی سطح پر تعلق کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مقصود ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ زبان اور سماج سے متعلق کتب اور اشاعتی مواد کا جائزہ لے کر انہیں اس تحقیق کی بنیاد بنایا جائے۔ زبان اور اس کے سماجی استعمال کے موضوع پر گزشتہ چند دہائیوں کے دوران کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ زبان اور سماج کے تعلق کے موضوع نے کمپیوٹر اور جدید مواصلات کے ذرائع کی حیرت انگیز ترقی کے ساتھ ساتھ ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔ اس زمانے میں زبان اور سماج کے رشتے پہلے زمانے کی نسبت بہت زیادہ پیچیدہ ہو چکے ہیں۔ اردو ناول نے بھی اس نئے تعلق کی جھلک پیش کرنا شروع کی ہے۔ اب مختلف دائرے تیزی سے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ اردو ناول "قلعہ جنگی" اس لحاظ سے ایک اہم اور نمائندہ ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ناول نے صرف اپنی فنی خوبیوں کی بدولت قارئین کو متاثر کیا بلکہ اردو زبان میں بھی نئے موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی کام کا اضافہ کیا ہے۔

قلعہ جنگی کی جائزہ کاری کے لیے اس کا مطالعہ کے بعد سماجی بنت میں زبان کے کردار کی نہ صرف شناخت کی پیش کی گئی ہے بلکہ اس مطالعے سے حاصل ہونے والے نتائج کو تجزیاتی نظر سے بیانیہ طریقے میں مرتب کیا گیا ہے۔

مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:(Works Already Done)

قلعہ جنگی میں موجود سیاسی کلامیہ (Discourses) کے تنقیدی جائزے کے حوالے سے ابھی تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ البتہ مستنصر حسین تارڑ کے اس ناول کے فکر و فن کے دیگر پہلوؤں پر کام ہو چکا ہے۔

تحدید: (Delimitation)

اس مقالے کا دائرہ کار مستنصر حسین تارڑ کے ناول" قلعہ جنگی "تک محدود ہو گا۔ اس ناول میں افغانستان کے متعلق بدلتے ہوئے عالمی میعا اور اس کے پاکستانی معاشرے پر اثرات کا جائزہ کریٹیکل ڈسکورس انالسز کے ذریعے پیش کیا جائے گا۔

پس منظری مطالعہ:(Literature Review)

اس موضوع پر تحقیقی کام مکمل کرنے کے لیے مطلوبہ علم کی جو جہتیں بنتی ہیں ان میں فوکالڈین ڈسکورس اور اس ناول میں موجود ڈسکورسز کا تنقیدی جائزہ اور جدید دور میں زبان کا بطور ہتھار، زبان اور سماج کے تعلق پر بات کی جائے گی۔ پس منظری مطالعے کے طور پر مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے:

1. Critical Discourse Analysis by Norman Fairclough
2. Language and Power by Norman Fairclough
3. The Archaeology of Knowledge by Michel Foucault
4. Power Struggle In The Hindu Kush by Lt-Gen. Kamal Matinuddin
5. Ghost War by Steve Coll
6. قلعہ جنگی از مستنصر حسین تارڑ
7. فکشن، کلامیہ، اور ثقافتی میکانیت، فرخ ندیم، عکس پبلی کیشنز

تحقیق کی اہمیت:(Significance of Study)

تحقیق دراصل حقیقت کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ تحقیق چیزوں کو خالص ترین شکل میں دیکھتی اور دکھاتی ہے۔ تحقیق زندگی کے ہر شعبے میں ترقی لانے اور بہتر صورت حال پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ تحقیق کی اہمیت مندرجہ ذیل نکات سے ظاہر ہوتی ہے:

1. تحقیق انسان کی فکری، معاشرتی اور تہذیبی ترقی کا باعث ہے۔
2. تحقیق ماضی کے حقائق اور تجربات کا نچوڑ، حال کی صورت اور مستقبل کی راہنما ہے۔
3. زبان کے سماجی استعمال پر یہ تحقیق مندرجہ ذیل امور کی طرف راہنمائی کرتی ہے:
   i. کلامیہ (Discourse) کسے کہتے ہیں؟
   ii. تنقیدی تجزیہ کلامیہ (Critical Discourse Analysis) کیا ہے؟
   iii. کسی بھی کلامیہ کے پس پردہ مقاصد کیا ہوتے ہیں؟

ب: تعارف اور بنیادی مباحث

تنقیدی تجزیہ کلامیہ کا تاریخی پس منظر

تاریخی پس منظر:

مابعد جدیت کے شروع ہوتے ہی انسان نے فرد اور سماج میں موجود مسائل کا ادراک اور پھر ان کے حل کی تلاش ایک نئے زاویے نگاہ سے شروع کی۔ اس سے پہلے سماج اتنا اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ مختلف فلسفیوں اور سماجی سائنسدانوں نے سماجی بنت اور اس کے اہم ستون دریافت کیے۔ جن میں زبان سب سے اہم ستون کے طور پر سامنے آئی۔

نارمین فیئر کلف کی تھیوری "تنقیدی تجزیہ کلامیہ" دراصل مختلف لسانی سائنسی تنقیدی نظریات سے مل کر بنی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب "مابعد جدیدیت" شروع ہوتی ہے تو زندگی کے مختلف شعبہ ہائے جات اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ لسانی سائنسی تنقید نے بھی نئے زمانے کے ساتھ اپنے تنقیدی اصول بدلتے ہوئے، زبان کو منطق محض اور قواعد کے دائرے سے نکال کر، سماجی سطح پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے نتیجے میں تنقیدی تجزیہ کلامیہ وجود میں آیا۔

ڈسکورس کا تنقیدی تجزیہ ستر کی دہائی سے شروع ہوا اور بیسیویں صدی کے اختتام تک یہ کافی حد تک ترقی کر چکا تھا۔ ۱۹۸۵ء میں ایک برطانوی ماہر لسانیات ایم اے کے ہالیڈے (MAK Holliday) نے اپنی تھیوری نظاماتی تفاعلی لسانیات (Systematic functional Linguistics) پیش کی۔ جس میں ایم اے کے ہالیڈے نے زبان کے قواعد اور دیگر لسانی پہلوؤں کی بجائے، اس کے سماجی کردار پر بحث کی۔ نارمین فیئر کلف نے بھی اپنی تھیوری میں تنقیدی تجزیہ یہاں سے اخذ کیا۔ جبکہ ڈسکورس کو مشل فوکو کی تھیوری " ڈسکورس انالسز" سے لیا۔ اس کے علاوہ اور بھی جدید لسانیاتی مباحث اس تھیوری میں آکر ضم ہوئے ہیں۔ لیکن اس کی بنیاد میں ایم اے کے ہالیڈے اور مشل فوکو کی تھیوریز ہیں۔

ماضی کے بہت سارے ماہرین لسانیات نے بھی اس طرح کے تنقیدی تجزیے پر کام کیا ۔جن میں فاؤلر(Fauler)اور کرس(Kriss)کانام نمایاں ہے۔

تنقیدی تجزیہ کلامیہ کے گہرے مطالعے سے پتہ چلتاہے کہ درحقیقیت مشل فوکو کے "ڈسکورس انالسز" میں اگرمابعد جدیدت کے عناصر شامل کردیں تووہ نارمین فیئر کلف کا نظریہ "تنقیدی تجزیہ کلامیہ" بنتاہے۔

تنقیدی تجزیہ کلامیہ کے بنیادی مآخذ:

نارمین فیئر کلف کا شمار چونکہ مابعد جدیت کے لسانی نقادوں میں ہوتا ہے،اس لیے ہمیں ان کے نظریات میں مابعد جدیدت کے تمام رنگ نظر آتے ہیں۔ اس تھیوری کے مآخذ بیان کرتے ہوئے ہم سائنسئ لسانی تنقید کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔کیونکہ سی ڈی اے کے جڑیں کچھ حوالوں سے تنقیدی لسانیات میں ہیں۔بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سی ڈی اے، تنقیدی لسانیات کی ترقی یافتہ شکل ہے۔تنقیدی لسانیات کی اصطلاح سب سے پہلے کرس اور فاؤلر نے استعمال کی تھی۔گویایہ دونوں نقاد سی ڈی اے کی جڑوں کو جانتے ہیں۔

اس لیے ماہر لسانیات ہیلری جینکس(Hilary Janks)تنقیدی لسانیات پر بات کرتے ہوئے سی ڈی اے کے بارے کہتاہے؛

"Critical Discourse Analysis (CDA) stems from a critical theory of language which sees the use of language as a form of social practice. All social practice are tied to specific historical contexts and are the means by which existing social relations are reproduced or contested and different interests are served..............................Where analysis seeks to understand how discourse is implicated in relations of power, it is called critical discourse analysis." (۱)

تنقیدی تجزیہ کلامیہ (سی ڈی اے) زبان کے ایک تنقیدی نظریہ سے وجود میں آتا ہے، جو زبان کو بطور سماجی سرگرمیوں کے استعمال کے طور پر دیکھتاہے۔تمام سماجی سرگرمیاں مخصوص تاریخی سیاق وسباق سے منسلک ہیں اور وہ ذرائع ہیں، جن کے ذریعے موجودہ سماجی تعلقات کو دوبارہ پیدا کیا جاتا ہے یا ان مقابلہ کیا جاتاہے اور مختلف مفادات کو

پورا کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل زبان سے جڑے مفادات سے متعلق سوالات ہیں ۔ متن کے پیداواری ذرائع کیا ہیں؟ متن کی موجودہ حالت سے کس کے مفادات پورے ہوتے ہیں؟ کس کے مفادات کی نفی ہو رہی؟ اس متن کے استعمال کے بعد نتائج کیا ہیں؟ اس کا تعلق کن طاقت کے مراکز سے ہے؟ جہاں تنقیدی تجزیہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ سماج اور طاقت کے تعلقات میں ڈسکورس کس طرح اثر انداز ہوتا ہے، اسے تنقیدی تجزیہ کلامیہ کہا جاتا ہے۔

سی ڈی اے کی پیدائش دو نظریات سے ہوتی ہے، ایک تنقیدی لسانیات اور دوسرا ڈسکورس نالسز۔ نارمین فیئر کلف نے ''تنقیدی لسانیات '' سے تنقید کو لیا اور مشل فوکو کے '' ڈسکورس نالسز'' سے ڈسکورس کو لیا۔ پھر ان کے مطالعے سے اخذ ہونے والے نظریے کو'' کریٹیکل ڈسکورس انالسز '' کا نام دیا۔ فیئر کلف اپنی کتاب ''لینگوئج اینڈ پاور'' (Language and Power) میں بنیادی لسانیات پر بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ موجودہ لسانیات میں زبان کے سماجی مطالعے تو موجود ہیں لیکن ان میں زبان اور طاقت کے درمیان تعلق پر کوئی بحث نہیں ملتی۔

> "Mainstream linguistics is an asocial way of studying Language, which has nothing to say about relationships between language and power and ideology" (۲)

گویا فیئر کلف نے اپنی کتاب کے شروع میں ہی یہ بات واضح کر دی کہ تنقیدی تجزیہ کلامیہ کا تعلق سماجی سطح پر ادا ہونے والے زبان اور طاقت کے تعلق سے متعلق ہے۔ انسان نے اس سے پہلے کبھی بھی زبان اور طاقت کے تعلق پر بات نہیں کی۔ کیونکہ ماضی میں زبان اور طاقت کا دائرہ کار جدا سمجھا جاتا رہا۔ جس کی وجہ سے سماجی سطح پر زبان اور طاقت کے تعلق پر بہت ہی کم مواد ملتا ہے۔

زبان کے لسانی اور قواعد کی رو سے جائزے اب جدید دور کے لسانی مسائل حل کرنے میں ناکام نظر آ رہے تھے۔ زبان اب قواعد اور منطق کے دائرے کی بجائے سماجی سطح پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں میں ایک اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ماہرین لسانیات نے زبان کے جائزے کو نئے زاویوں سے دیکھنا شروع کیا تھا۔ یہ نئے زاویے لسانی مطالعات سے ترقی کرتے ہوئے ڈسکورس تک پہنچے، پھر اسی ڈسکورس کے کئی تنقیدی زاویے وجود میں آئے جن میں نارمین فیئر کلف کا تنقیدی تجزیہ کلامیہ اہمیت کا حامل ہے۔

فیئر کلف کے اہم خدشات میں سے ایک یہ ہے کہ معاشرہ بنیادی طور پر جبر پہ استوار ہے۔ کوئی بھی معاشرہ بزور طاقت ایسے قانون نافذ کر سکتا ہے، جو اسے خود کو بر قرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ زبان (تحریر، آواز، تصویر) کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی زبان کا بطور طاقت استعمال۔ ہر معاشرہ اپنے آپ کو بر قرار رکھنے کے لیے طاقت کے استعمال کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم کسی بھی معاشرے میں اپنی بقا کے لیے اٹھائے جانے والے کسی بھی قدم کو منطقی طور پر غلط نہیں کہہ سکتے، ہاں اسے ہم کہیں نہ کہیں اخلاقی سطح پر اچھا یا برا کہہ سکتے ہیں۔ برا صرف اس انداز میں میں جب وہ دوسرے معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔

کسی بھی معاشرے میں طاقت کے استعمال استعداد اس کے اندر ہوتی ہے۔ ہر معاشرہ اس طاقت کو بذات خود ضرورت کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ لیکن طاقت کے استعمال کو جائز بنانے کے لیے اسے ریاست کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب معاشرہ اس طاقت کو ریاست کی مرضی کے بغیر استعمال کرتا ہے تو یہ طاقت کا غیر قانونی استعمال کہلاتا ہے۔ جبکہ ہر معاشرے کے پاس یہ حتمی حق محفوظ ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے اس طاقت کو استعمال کر سکتا ہے۔ یہ حق اسے کوئی باہر سے تفویض نہیں کرتا، بلکہ اس کے بطن میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن اس حق کے استعمال کو جائز بنانے کے لیے اسے ریاست کی مرضی کے حصول کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن کسی بھی معاشرے میں طاقت کے استعمال کا یہ نظام اگر مستقل ہو جائے، تو وہ معاشرے کے لیے تباہی کا باعث بنتا ہے۔ اس کی بہترین مثال پاکستان کی ہے۔ پاکستان نے جب زبان اور طاقت کو استعمال کرتے ہوئے افغانستان اور روس کی جنگ کے لیے جہادی ڈسکورس ترتیب دیا، وہ تب تک درست انداز میں چلتا رہا جب تک ریاست کے زیر اثر رہا، لیکن جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ طاقت کا کوئی بھی ڈسکورس جب مستقل ہو جائے تو ریاست کے دائرہ اختیار سے نکل جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی جب ریاست نے اس جہادی ڈسکورس پر اپنا کنٹرول کھویا تو، پورے معاشرے نے اس طاقت کی استعداد کو اپنے طرف سے استعمال کرنا شروع کیا، جس کی وجہ سے یہ معاشرہ تباہ ہو کر رہ گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ سماجی سطح پر طاقت کا استعمال کس طرح کیا جاتا ہے؟ در حقیقت اس کی بنیاد بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ معاشرے کے اندر طاقت کے تعلقات کی عدم مساوات کو فطری بنانے کے لیے زبان کا استعمال کس طرح کیا جاتا ہے۔ نارمین فیئر کلف اپنی تھیوری کے ذریعے، طاقت کے ان تعلقات میں زبان کے استعمال کی وضاحت کرتا ہے۔

مشل فوکو کا ڈسکورس انالسز:

"ڈسکورس" مشل فوکو کا سب سے اہم اور بنیادی کام ہے۔ یہ سب سے زیادہ آسانی سے اخذ کردہ فوکولاڈین اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ "فوکالڈین انالسز" اب اپنے طور پر ایک الگ علمی و تحقیقی میدان بن چکا ہے۔

مشل فوکو نے اپنی تھیوری ڈسکورس کے بارے میں بہت سی جگہوں پر بات کی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مفصل بات انہوں نے اپنی کتاب آرکیالوجی آف نالج میں کی ہے۔ اس کتاب میں فوکو نے ڈسکورس کی وضاحت کرنے سے پہلے چند چیزوں کی نفی کی ہے کہ ڈسکورس کیا کیا نہیں ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ ڈسکورس ایک مفروضہ (Hypothesis) بھی نہیں، یہ ایک جملہ (Sentence) بھی نہیں، یہ کوئی بیان (Statement) بھی نہیں، بلکہ یہ ان سب چیزوں کا ایک نہایت پیچیدہ مرکب ہے۔

علم، طاقت، کلچر، زبان، ریاست، سماج وغیرہ، مشل فوکو کے ڈسکورس کے بنیادی اجزا ہیں۔ ان اجزاء کو مشل فوکو اپنی کتب میں "علمی ڈھانچہ" (Body of Knowledge) کہتا ہے۔ پھر اس ڈسکورس کے ماہرین ہونے چاہیں، جنہیں مشل فوکو Practioner کہتا ہے۔ اس ڈسکورس کے اطلاقی پہلوؤں پر بات کرنے کیلئے فلسفی ہونے چاہیں۔ پھر اس مطالعے کے مقاصد (Objects of Study) ہوں، پھر ان تمام چیزوں کا تحقیقی طریقہ کار ہونا چاہیے۔ مشل فوکو کہتا ہے کوئی بھی ڈسکورس ان تمام مراحل سے گزر کر معاشرے پر اپنا اثر دکھاتا ہے۔

عام طور پر ہمارے ہاں نظریے اور ڈسکورس میں ابہام باقی رہتا ہے۔ کیونکہ اردو زبان میں ڈسکورس کے متبادل جتنے بھی الفاظ مستعمل ملتے ہیں، وہ ڈسکورس کے کوئی معنی واضح کرنے سے قاصر ہیں۔ ڈسکورس اور نظریے میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک ڈسکورس بہت سارے نظریات پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ یعنی ایک ڈسکورس کے اندر کئی نظریات ہو سکتے ہیں۔ جیسے نسلی امتیاز کے ڈسکورس میں نسلی شناخت، لسانی شناخت، گورے اور کالے کی شناخت، برتری اور کمتری کے نظریات کو شامل کیا جاتا ہے۔ یعنی نظریہ ایک واحد نقطہ نظر ہے جبکہ بہت سارے نظریات مل کر جب کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے استعمال ہوں وہ ڈسکورس کہلاتا ہے۔

مشل فوکو اس کتاب کی ابتدا ہی میں یہ بات واضح کرتا ہے کہ کسی بھی ڈسکورس کو قائم کرنے کیلئے سب سے پہلے اس ڈسکورس کے بارے سائنسی یا منطقی علم ہونا چاہیے، اس کے بعد اس علم کو شائع کیا جائے، پھر کے پروفیسر زہوں اس کے نقاد ہوں اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والے لوگ ہونے چاہیئں۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ان سب لوگوں کا کسی نہ کسی طاقت کے مرکز کے ساتھ تعلق ہو، اور پھر ان لوگوں کے پاس اتنی طاقت ہو کہ جب وہ اپنے مخصوص ڈسکورس کے بارے میں کوئی رائے دیں، تو اسے حتمی اور سائنسی سمجھا جائے۔ اس کے بعد ڈسکورس اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ فوکو ڈسکورس کے بارے یہ کہتا ہے کہ یہ مادی ہوتا ہے۔ یعنی کسی بھی ڈسکورس کا اطلاق کرنے کے لیے اس کو چلانے والے ہونے چاہیے اور ان لوگوں کے پاس بہت سارے لوازمات ہونے چاہیں، جیسا کہ علم، فلسفہ، زبان، طاقت، سماج، کلچر، کسی مخصوص شعبہ علم کے ماہرین، ریاست، جامعات، ادارے، اسناد، ڈگریاں اور دفتر وغیرہ ہونے چاہیں۔

“We must also describe the authorities of delimitation: in the nineteenth century, became the major authority in society that de limited, designated, named, and established madness as an object.”(۳)

فوکو نے تاریخی طور پر ایک ایسے سماجی نظام کی نشاندہی کرنے کے لیے 'ڈسکورس“ کی اصطلاح ایجاد کی ہے جو علم اور معنی کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنے مطالعے میں یہ بات ثابت کرتا ہے کہ ڈسکورس مادی طور پر اثرانداز ہوتا ہے، جس کو وہ کہتا ہے کہ ”ایسی سرگرمیاں جو منظم طریقے سے ان چیزوں کی تشکیل کرتی ہیں جن کے بارے میں وہ بولتے ہیں“۔

“Practices that systematically form the objects of which they speak.”(۴)

ڈسکورس کا تعلق چونکہ زبان سے ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم تمام افعال، کسی نہ کسی زبان کے ذریعے سمجھتے ہیں، پھر انہیں اپنی سمجھ کے مطابق سرانجام دیتے ہیں۔ اس لیے انفرادی سطح پر ہمارا کوئی بھی فعل جبکہ سماجی سطح پر کوئی بھی سرگرمی ”ڈسکورس“ کے اثر سے باہر نہیں ہو سکتی۔ ہماری انفرادی تربیت اور سماجی ساخت کسی نہ کسی

ڈسکورس کے زیرِ اثر تکمیل پاتی ہے۔ سٹیورٹ ہال (Stuart Hall) اپنے ایک تحقیق مقالے میں ڈسکورس پر بات کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Nothing meaningful exists outside of discourse."(۵)

سٹیوارٹ ہال کے مطابق " ڈسکورس کے باہر کچھ بھی بامعنی نہیں "۔یعنی ڈسکورس کے باہر کسی معنی کا کوئی وجود نہیں۔ مثال کے طور پر ہم شیعہ اسلامی ڈسکورس کے اندر دس محرم کی مجالس اور کربلا سے جڑی ہوئی تمام سرگرمیاں جب کسی اسلامی ملک میں سرانجام دیتے ہیں تو، ان تمام شیعہ اسلامی سرگرمیوں کو کربلا کا ڈسکورس معنی دے رہا ہوتا ہے۔ جبکہ اگر ہم یہی سرگرمیاں کسی غیر مسلم ملک میں سرانجام دلوائیں تو وہاں ان کی کوئی معنوی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔

اس کے علاوہ کسی ایک ڈسکورس کے زیرِ اثر بہت سارے مذہبی ڈسکورس لے لیجیے، اُس میں متون (Text) بھی شامل ہیں، اُن متون کی نئی تفہیمات و تعبیرات کرنے والے لوگ بھی شامل ہیں، ایک مذہبی شعبے کے سارے کے سارے علم رکھنے والے لوگ بھی اس میں شامل ہیں یا ہوسکتے ہیں کہ جن کے مآخذات کے ساتھ بات کی جاسکتی ہے کہ پہلے مصنف نے یہ تحریر کیا اس کے بعد دوسرے لکھنے والے نے یہ حوالہ استعمال کیا پھر تیسرے نے یہ لکھا، پھر اس میں مذہبی معلم بھی شامل ہوسکتے ہیں یا ہوتے ہیں، مولوی، پریسٹ، مبلغ، پروہت، پنڈت وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام لوگ مذہبی مواد یا متون کی موجودہ دور یا موجودہ حالات و واقعات کے تناظر میں نئی تشریحات، توضیحات اور تفہیمات و تعبیرات کرتے ہیں۔ وہ مذہبی متون (Religious Text) کی وضاحت کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، وہ اپنی مذہبی شناخت، کام اور پوزیشن کے حوالے سے غور و فکر بھی کرتے ہیں۔ پھر اُس ساری تحریر کا مادی اثر کیا ہے؟ کہ انسان کا لباس، روایات، اعتقادات، اخلاقیات، گفتگو کا طریقہ اور طرزِ زندگی وغیرہ اور پھر یہ کہ جو وہ لباس پہنتا کرتے ہیں، کس طرح کا ہو گا، یا کیسا ہوسکتا ہے، اس طریقے سے تمام متوقع نتائج کو موضوعِ بحث بنایا جاسکتا ہے۔ ان کے نزدیک تقریر یا تحریر کا " مخصوص طریقہ " مزید کس طرح کے لوگوں کو متاثر کرے گا یا کر سکتا ہے، وہ اس لیے کہ یہ تمام لوگ بھی ڈسکورس کے زیرِ اثر ہوں گے۔ یہ تمام تبدیلیاں کسی بھی ڈسکورس کا مادی اثر کہلاتی ہیں۔ کہ مرد اور

عورت کا فلاں مذہب میں اس طرح کا لباس ہونا چاہیے، اور فلاں مذہب کی رو سے اس طرح کی اخلاقیات، اقدار و روایات اور اعتقادات ہو سکتے ہیں یا ہونے چاہییں وغیرہ وغیرہ یا اس طرح کی اخلاقی میعار ہو سکتے ہیں۔

اس طرح ڈسکورس علم کو منظم کرنے کا ایک طریقہ ہے، جو متضاد منطق کی اجتماعی تفہیم اور سماجی حقیقت کے طور پر ڈسکورس کو قبول کرنے کے ذریعے سماجی (اور آہستہ آہستہ عالمی) تعلقات کی تشکیل کرتا ہے۔ تاہم ڈسکورس سماجی ساخت کے اندر رہتے ہوئے طاقت کے اثرات سے تیار ہوتا ہے اور یہ طاقت زبان کے خاص اصول اور طاقت کے "مراکز" تخلیق کرتے ہیں، جو متضاد سسٹم کے اندر علم اور سچائی کو مقبول بنانے کے معیار کی وضاحت کرتے ہے۔

ڈسکورس میں ابتدائی سطح پر ان اصولوں اور طاقت کے دھاروں کو ترجیحی سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ڈسکورس ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مزید بر آں، معاشرے میں یہ اصول اور طاقت کے دھارے، ڈسکورس کے قواعد، بیانات ، یا متن کے معنی کو اجتماعی سماجی عقلیت کے لیے ساز گار بناتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں، ڈسکورس معنی کو تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں نئی سرگرمیوں کو جواز بھی مہیا کرتا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ کوئی ڈسکورس اپنے آپ کو ایک تاریخی، آفاقی اور سائنسی ، یعنی معروضی اور مستحکم بنا سکتا ہے۔

اسٹیفن گِل نے فوکو کے نظریہ ڈسکورس کو "وجود کی مخصوص شرائط کے ساتھ نظریات اور طرز عمل کا ایک مجموعہ کہاہے، جو کم و بیش ادارہ جاتی ہیں، لیکن جو صرف ان لوگوں کے لیے جزوی طور پر سمجھے جاسکتے ہیں ، جن کا وہ احاطہ کرتے ہیں"۔

"A set of ideas and practices with particular conditions of existence, which are more or less institutionalized, but which may only be partially understood by those that they encompass."(٦)

کوئی بھی ڈسکورس اپنے زیر اثر پیدا کردہ متن کی مخصوص معنی کے تناظر میں تفہیم کرتا ہے۔ یہ اپنے پیدا کردہ معانی کے علاوہ دوسرے تمام معانی اور تشریحات مسترد کر دیتا ہے۔ فوکو کے مطابق ڈسکورس کے نتیجے میں پیدا ہونے

والی سرگرمیاں دوسرے تمام متون کی معنویت کو ذائل کر دیتی ہیں، تاکہ سماجی سطح پر ان تضادات کو ختم کیا جاسکے، جو ڈسکورس کے معنی اور طاقت کو چیلنج یا غیر مستحکم کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ فوکو مزید کہتا ہے کہ ہر معاشرے میں ڈسکورس کی پیداوار کو ایک ہی وقت میں، ایک خاص طریقہ کار کے ذریعے کنٹرول، منتخب، منظم اور بار بار دہرایا جاتا ہے، تاکہ اس کے مخالف طاقت اور خطرات کو روکا جاسکے، اور اس دوران ہونے والے واقعات پر غلبہ حاصل کرنا ڈسکورس کے لیے انتہائی ضروری ہوتا ہے۔

"In every society the production of discourse is at once controlled, selected, organized and redistributed by a certain number of procedures whose role is to ward off its powers and dangers, to gain mastery over its chance events, to evade its ponderous, formidable materiality."(۷)

مشل فوکو اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی بھی ڈسکورس کو رائج کرنے اور اس سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کیلئے متن(Text) کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کی تشریح اس ڈسکورس کے تناظر میں کی جاتی ہے۔

مشل فوکو کے مطابق متن کی ڈسکورس کے مطابق تفہیم ،ڈسکورس کے اطلاق کا پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرے مرحلے پر وہ لوگ آتے ہیں، جو اس متن کی تفہیم کے حوالے سے ماہرین کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ ماہرین تفہیم کے تکراری عمل کے ذریعے ڈسکورس کو لوگوں کے ذہن تک پہنچاتے ہیں۔اس کے بعد وہ سماج اور ڈسکورس کی پیدا کردہ سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں یا انہیں مخصوص ڈسکورس کے ذریعے تبدیل کرتے ہیں۔ یہ ماہرین سماجی شعور کی ان جہات کا تعین کرتے ہیں، جن کے ذریعے ڈسکورس کو علم کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ ڈسکورس ایک علمی حقیقت پیدا کرتا ہے۔کنٹرول اور نظم وضبط کی ایک تکنیک بن جاتا ہے۔ اس کے بعد معاشرے میں ہر وہ بات غلط تصور کی جاتی ہے جو اس ڈسکورس سے باہر ہو۔

مشل فوکو نے اپنی آخری تصنیف دا ہسٹری آف سیکشوئیلٹی(The History of Sexuality) میں ڈسکورس کے تنقیدی اور اطلاقی پہلوؤں پر مفصل بات کی ہے۔اس کے لیے وہ جنسیت کی مثال دیتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ جنسیت پر اتنی وسیع بحث کیوں کی گئی ہے،اور اس کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟جو کہا گیا اس سے پیدا ہونے والی طاقت کے کیا اثرات تھے؟اس کے بعد مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ اس حقیقت کا محاسبہ کیا جائے کہ اس کے بارے میں کیا بات کی جاتی ہے،یہ جاننا ہے کہ کون بولتا ہے،پوزیشنز اور وہ نقطہ نظر جن سے وہ بولتے ہیں،وہ ادارے جو لوگوں کو اس کے بارے میں بات کرنے پر اکساتے ہیں اور جو تحریر یا تقریر کا ذخیرہ تقسیم کرتے ہیں۔مسئلہ کیا ہے،مختصراً،مجموعی طور پر "متضاد حقیقت" ہے،جس طرح سے جنسی تعلقات کو "ڈسکورس" میں ڈھالا جاتا ہے۔

"Why has sexuality been so widely discussed, and what has been said about it? What were the effects of power generated by what was said? .....the institutions which prompt people to speak about it and which store and distribute the things that are said. What is at issue, briefly, is the over—all 'discursive fact', the way in which sex is 'put into discourse". (۸)

فوکو جس چیز کو وسیع اصطلاحات میں بیان کرتا ہے وہ ڈسکورس کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔اس تجزیے میں وہ اس حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور طاقت کے ان اثرات کا تجزیہ کرتا ہے جو کسی متن(تحریر،تصویر،آواز) سے پیدا ہوتے ہیں۔مزید برآں ڈسکورس سماجی سطح پر قبول شدہ معانی کے نظام کو توڑتا ہے اور ان طریقوں کو ظاہر کرتا ہے ،جن میں غالب ڈسکورس حقیقتوں کو خارج کرتا ہے یا غیر مستحکم کرتا ہے۔مجموعی طور پر مشل فوکو ڈسکورس انالسز کے ذریعے اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ معاشرے میں زبان کے ذریعے طاقت کو کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔

کسی بھی موضوع پر مستند یا معتبر گفتگو کرنے کو کلامیہ یا Discourse کہتے ہیں۔کسی بھی ڈسکورس یا کلامیہ کے پیچھے تین طرح کی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں:

ا۔ کوئی بھی علم کا میدان،جس کی(کُتب کی)اِشاعت ہو۔

۲۔ جس کے پیچھے اعلیٰ تعلیمی ادارے؛یونیورسٹیاں اور کالجز وغیرہ، ہوں۔

۳۔ جس کے پروفیسرز، نقاد (Critics) اور پیروکار (Followers) ہوں۔

ان تین اجزا کی سرپرستی میں جو بھی کچھ لکھ کر سامنے آتا ہے،اُسے سائنس کی طرح سچ سمجھا اور جانا جاتا ہے۔

فُوکو کہتا ہے کہ ڈسکورس کا اثر مادی (Material) ہوتا ہے کیونکہ اس کو آگے بڑھانے کے لیے آپ کو آلات کی طرح کے اداروں؛ریاست، یونیورسٹیوں، پروفیسروں،ڈگریوں اور ڈپلوموں کی ضرورت ہوتی ہے، جن کے سماج پر اثرات بالکل مادی ہوتے ہیں۔یعنی یہ لوگوں کے طرزِ عمل پر اثرانداز ہوتے ہیں۔حقیت کے متعلق ہمارا سارا علم ڈسکورس پر مبنی ہوتا ہے۔ہم حقیقت کو ڈِسکورس ہی کے ذریعے جانتے ہیں۔

مندرجہ بالا استدلال اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ فوکو اپنے علم،ڈسکورس اور سماج کے تجزیہ کے امکان کو کس قدر دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔وہ تجزیے کے ماڈل کو ہر جگہ لاگو کرنے کی تجویز نہیں دے رہا نہ ہی اس بات سے ناواقف ہے کہ مستقبل میں اس کے ڈسکورس کے تجزیے کا کوئی دوسرا بندہ تجزیہ کرے گا۔فوکو اپنی تمام کتب میں کسی بھی ڈسکورس پر تنقید نہیں کرتا بلکہ اس پر ایک آزاد موضوع کے طور پر کام کرتا ہے۔یہ بات بھی کافی دلچسپ ہے فوکو اپنی فکر میں کوئی اختتام یا کوئی حتمی سچ قائم نہیں کرتا۔پھر بھی ان کی کتاب کا نچوڑ آج کے باقی ماندہ "ماڈرنسٹ" یا "روشن خیال" مفکرین کی مایوسی ہے۔وہ سچائی یا سائنس کے نظام کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے، بلکہ اس کے برعکس ان کی خود ساختہ شہادتوں سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔یہ جزوی طور پر فوکو کی استعمال کردہ زبان کی پیچیدگی کی وضاحت کرتا ہے۔کیونکہ وہ اپنے تجزیے کے خود ساختہ ثبوت کو فرض کرکے اسی جال میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لہٰذا،وہ جو تجویز کرتا ہے وہ علم کے شعبوں کو دیکھنے کے لیے ایک ذریعہ ہے،نہ کہ کوئی انتہا۔اس نے جو تجویز پیش کی ہے وہ ان رکاوٹوں کو نہیں توڑ رہی ہے جو ہم پر زبان کی وجہ سے رکاوٹیں ہیں۔کیونکہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ ان رکاوٹوں سے آگاہ ہونا ہے۔

تنقیدی تجزیہ کلامیہ (Critical Discourse Analysis)

تنقیدی تجزیہ کلامیہ (Critical Discourse Analysis) ڈسکورس کے تنقیدی جائزے کا ایک طریقۂ کار ہے ۔ جس میں ہم کسی بھی ڈسکورس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ یہ جدید لسانیات کی ایک نئی تنقیدی شاخ ہے، جو حالیہ برسوں میں سامنے آئی ہے۔ تنقیدی تجزیہ کلامیہ میں محقق کی توجہ صرف اس بات پر نہیں ہوتی کہ زبان کیا ہے، بلکہ وہ اس پہلو پر بھی غور کرتا ہے کہ مخصوص معاشرے میں زبان ایک مخصوص حالت میں کیوں موجود ہے۔ دوسرے الفاظ میں تنقیدی تجزیہ کلامیہ کسی بھی ڈسکورس کے مختلف معانی دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ یعنی اس میں ہم کسی خاص معاشرے میں رائج کسی خاص ڈسکورس کی زبان (تحریر ، آواز، تصویر) کا تنقیدی جائزہ لے کر اس کے سماجی سطح پر مقاصد دریافت کرتے ہیں۔ اس حوالے سے نارمین فیئر کلف اپنی کتاب " لینگوئج اینڈ پاور " کے شروع میں لکھتا ہے کہ زبان تمام شہریوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کافی اہم ہے۔ خاص طور پر، جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے، کوئی بھی شخص جسے جدید معاشرے میں دلچسپی نہیں ہے، اور یقیناً کوئی بھی شخص جسے جدید معاشرے میں طاقت کے رشتوں میں دلچسپی ہے، زبان کو نظر انداز کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

"Language is therefore important enough to merit the attention of all citizens. In particular, so far as this book is concerned, nobody who has an interest in modern society, and certainly nobody who has an interest in relationships of power in modern society, can afford to ignore language".(۹)

دراصل " تنقیدی تجزیہ کلامیہ " زبان کی سطح پر اس کے متعلقہ سماج میں گہرے اثر و رسوخ کی دریافت کا نام ہے۔ سماجی سطح پر زبان، نظریہ اور طاقت کا آپس میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ کسی بھی نظریے کو، یہاں تک کہ کسی بھی بات یا لفظ کو معاشرے میں رائج ہونے کے لیے زبان اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ نظریہ، بات، یا لفظ کسی بھی معاشرے میں رواج پا کر وہاں کی فکری و عملی زندگی میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ اس

سارے عمل کو ہم ڈسکورس کہتے ہیں۔نارمین فیئر کلف نے اسی ڈسکورس کا تنقیدی جائزہ لینے اصول وضع کیے ہیں۔ جس کو ہم نارمین فیئر کلف کا سہہ جہتی ماڈل (Three Dimensional Module) کہتے ہیں۔ جس کے ذریعے ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ زبان ، نظریہ اور طاقت مل کر سماجی ساخت پر کسے اثر انداز ہوتے ہیں۔

نارمین فیئر کلف کا سہہ جہتی ماڈل کسی بھی ڈسکورس کا تین پہلوؤں سے احاطہ کرتا ہے۔ پھر ان تین پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔ جس میں تحریر، اس کے بعد اس کے پیداواری ذرائع (Production and Consumption Of Text)،اس کے بعد اس کی سماجی سرگرمیاں (Social Practice) شامل ہیں۔
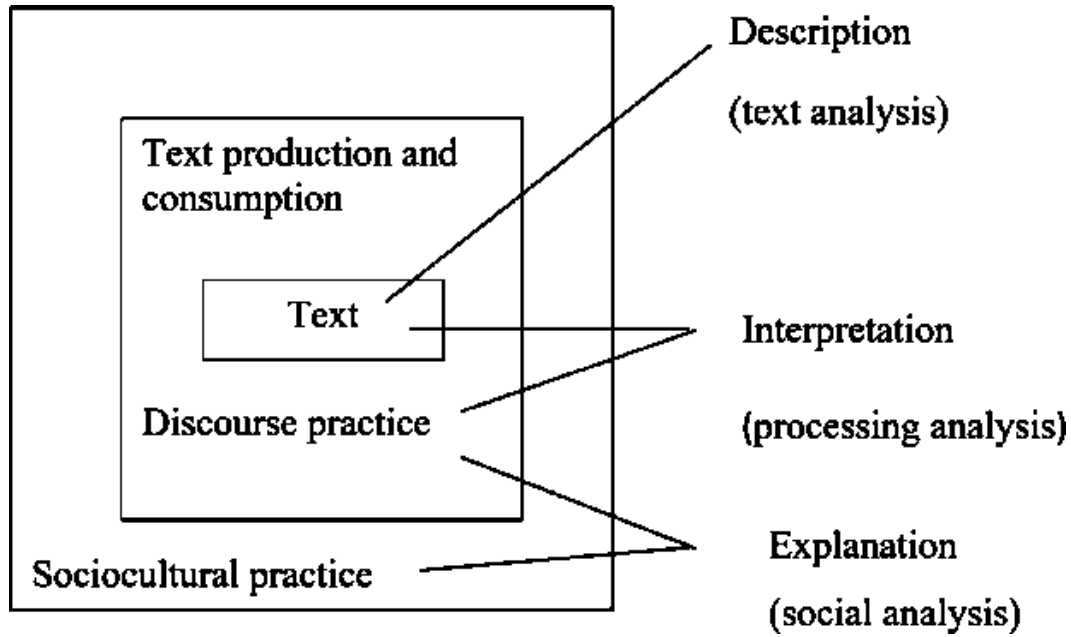
مندرجہ بالا ڈایاگرام نارمین فیئر کلف کے سہہ جہتی ماڈل کا ہے۔ جس کے تین مراحل ہیں، ان میں پہلا تحریر یا تقریر کی جانچ پڑتال ہے، دوسرا اس کے پیداواری ذرائع اور متن اور ان کے آپسی تعلق کی تفہیم اور تیسرا مرحلہ اس تحریر سے پیدا یا متاثر ہونے والی سماجی سرگرمیاں ہیں۔

متن کا تجزیہ (Text Analysis)

فیئر کلف کے نزدیک کسی بھی ڈسکورس کے تنقیدی جائزے کے لیے، پہلا مرحلہ اس ڈسکورس کے متعلق متن کی جانچ پڑتال کا ہوتا ہے۔ جس میں ہم کسی بھی متن کی لسانی خصوصیات کو سامنے رکھتے ہیں۔ اس متن میں موجود مخصوص الفاظ، جملوں کی بناوٹ، کون سے الفاظ مسلسل دہرائے جا رہے ہیں، کن موضوعات پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے، اس کے ساتھ متن میں کیا بات ہو رہی ہے یا سماجی سطح پر کس طرح کا متن (تحریر، تصویر، آواز) پہنچائی جا رہی ہے۔ اس مرحلے پر ہم ان تمام ذرائع سے متن کو اکٹھا کرتے ہیں جن کے ذریعے اسے پھیلایا جا رہا ہوتا ہے۔

فیئر کلف کے الفاظ میں یہ وہ مرحلہ ہے جس میں ہم زبان کی رسمی خصوصیات کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

"Description is the stage which is concerned with formal properties of the text"(۱۰)

مثال کے طور پر وہ ذرائع، تصویر، کتاب، اخبار، فلم، ڈرامہ، ڈاکومنٹری، ٹیلیفون کال وغیرہ کچھ بھی ہو سکتے ہے۔ اس مرحلے پر ہم ان تمام ذرائع سے حاصل ہونے والا مواد اکٹھا کرتے ہیں، جن کے ذریعے ایک مخصوص ڈسکورس کا ادب نشر کا جاتا ہے۔ تنقیدہ تجزیہ کلامیہ کا یہ پہلا اور بنیادی مرحلہ ہے۔ یہاں ہمیں اس بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ متن کے تجزیے کے لیے غیر ضروری اور متضاد مواد نہ جمع ہو جائے۔ کیونکہ اگر بنیاد میں کمی رہ گئی تو پھر ڈسکورس کا تنقیدی تجزیہ ہمیں غلط نتائج فراہم کر سکتا ہے۔ یہاں فیئر کلف متن کی صرف ایک قسم تصویر کے بارے لکھتا ہے۔

متنی تجزیہ ایک وسیع اصطلاح ہے۔ جس میں متنی مواد (بشمول نثر، فلم، گیمز، کامکس وغیرہ) کی تشریح کرنے کے مختلف طریقوں کو شامل کیا گیا ہے۔ تجزیہ کا مقصد متن کی گہرائی سے تفہیم پیش کرنا، متن بنانے یا بنانے کے عمل کی جانچ کرنا، یا متن کے دوسرے شعبوں (جیسے فلسفہ، سماجیات، الہیات وغیرہ) سے تعلق پر روشنی ڈالنا ہو سکتا ہے۔ متنی تجزیہ عام طور پر متن کو قریب سے پڑھنے سے شروع ہوتا ہے (یا ایک سے زیادہ متن، اگر گفتگو کا تجزیہ کر رہے ہوں)، جس میں آپ متن سے خود کو واقف کرتے ہیں اور اس کے بارے میں سوالات کرتے ہیں۔ ان شعبوں میں اس کی صنف، موضوعات، استعارہ، زبان کا استعمال، بیانیہ کی ساخت وغیرہ شامل ہیں۔ ایک بار جب آپ ان عناصر پر گہری گرفت حاصل کر لیں، تو آپ اس بارے میں سوالات پوچھنا شروع کر سکتے ہیں کہ متن معانی اور ثقافتی ڈسکورس کو قریب سے

دیکھنے کے لیے کیوں یا کیسے استعمال ہوتا ہے۔ کسی بھی ڈسکورس کے متن کا یہ گہرا مطالعہ ہمیں تحقیق کے پہلے سوال کا پتہ دیتا ہے۔

"Not all photographs are equal: any photograph gives one image of a scene or a person from among the many possible images. The choice is very important, because different images convey different meanings".(۱۱)

یعنی تمام تصویریں برابر نہیں ہوتیں، کوئی بھی تصویر ایک منظر یا کسی شخص کی بہت سی ممکنہ تصاویر میں سے ایک تصور دیتی ہے۔ انتخاب بہت اہم ہے، کیونکہ مختلف تصاویر مختلف معنی بیان کرتی ہیں۔ آج کل کے جدید دور میں زیادہ تر آڈیو اور ویڈیوز کے ذریعے معلومات آگے پہنچائی جاتی ہیں ۔ جس میں نہ صرف چیزیں بیان ہوتی ہیں بلکہ دکھائی بھی جارہی ہوتی ہیں۔ سوویت افغان جنگ کے دوران، ہزاروں کی تعداد میں ایسی تصویریں افغانستان، پاکستان اور عرب ممالک پھیلائی گئیں جن کے ذریعے افغانستان میں روس کے مظالم دردناک انداز میں پیش ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسی لاکھوں ویڈیوز بنا کر مذکورہ ممالک کی عوام میں پھیلائی جاتی تھیں جن میں جہاد کو ایسے انداز میں پیش کیا جاتا تھا کہ دیکھنے والا اس کے سحر سے باہر نہ نکل پاتا۔

فیئر کلف یہاں ہر اس ذریعہ کو متنی جائزے میں شامل کرتا ہے جو کسی بھی طرح مخصوص ڈسکورس کے متعلق معلومات کو آگے پہنچا رہا ہو۔ اس میں آڈیوز، ویڈیوز، تقاریر، تصاویر، تحاریر، اشارے سب کچھ شامل ہے۔

متن کی تشریح (Interpretation)

ڈسکورس کے تنقیدی جائزے میں دوسرے مرحلے پر ہم دو چیزیں دیکھتے ہیں، پہلے ہم متن کی پیداوار اور اس کے پیداواری ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ پھر ہم اس کا استعمال دیکھتے ہیں کہ یہ متن کہاں استعمال ہوا ہے۔ بنیادی طور پر اس مرحلے میں ہم ڈسکورس سے پیدا ہونے والی سرگرمیوں کی تفہیم کرتے ہیں۔ متن (تحریر، تصویر، آواز) میں استعمال ہونے والے الفاظ کو دیکھا جاتا ہے، کس طرح کا ذخیرہ الفاظ استعمال ہوا ہے؟ اس کے پسِ پردہ کیا مقاصد ہو سکتے

ہیں؟اس کے بعد یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس متن (text) کا ہدف کون لوگ ہیں۔اس متن اور ہدفِ متن کے درمیان کیا تعلق پایا جاتا ہے؟متن کو پیش کرنے والے ذرائع کیا ہیں؟ان ذرائع کے ہدفِ متن لوگوں سے کیا مفاد وابستہ ہو سکتے ہیں؟ان سب سوالوں کا جواب دوسرے مرحلے پر تلاش کیا جاتا ہے۔

"Interpretation is concerned with the relationship between text and interaction - with seeing the text as the product of a process of production, and as a resource in the process of interpretation". (۱۲)

فیئر کلف کے نزدیک کلامیاتی سرگرمیوں کے تشکیلی نظام سے مراد تعلقات کا ایک پیچیدہ گروہ جو کہ ایک اصول کے طور پر کام کرتا ہے، یہ اس بات کو بیان کرتا ہے کہ سماجی سرگرمیوں میں فلاں فلاں تصور کے لیے کون سا متن ہونا چاہیے۔اس کام کے لیے کس طرح کی حکمت عملی کو منظم کیا جائے۔ تشکیل کے اس نظام کے تمام اجزا کو انفرادی سطح پر منظم کرنا ضروری ہے۔کیونکہ ڈسکورس میں تمام متنی ذرائع جداگانہ اہمیت رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ڈسکورس کا کوئی مرکز نہیں ہوتا،جہاں سے اس ڈسکورس کو چلایا جارہا ہو،یا اس کی طاقت کسی ایک پہلو کی وجہ سے نہیں ہوتی۔

متن کی تشریح کے مرحلے پر ہم متن میں بنیادی طور پر چار خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں۔جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ذخیرہ الفاظ:

اس میں یہ دیکھتے ہیں کہ مخصوص ڈسکورس کا متن کس طرح کا ذخیرہ الفاظ رکھتا ہے۔کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ انسانی ذہن اپنے پاس محفوظ ذخیرہ الفاظ کے باہر سوچنے سے قاصر ہے۔اس لیے مخصوص ذخیرہ الفاظ،کسی بھی ڈسکورس کے زیرِ اثر سماج کی مجموعی سوچ کو تبدیل کر دیتا ہے

۲۔ گرامر:

گرامر میں ہم جملے کی ساخت پر غور کرتے ہیں۔ اس کی فاعلی، فعلی اور مفعولی حالت کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتے ہیں۔

۳۔ ربط:

تیسرے مرحلے پر ہم متن میں ربط کو دیکھتے ہیں کہ آیا یہ متن اپنے ڈسکورس کے حوالے سے کتنا مربوط ہے۔ یہ متن اپنے مصنف، متن اور قاری کے درمیان کس قدر ربط پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس متن میں جن معلومات کو بار بار دہرایا جارہا ہے وہ کس حد تک متن اور ڈسکورس کے ساتھ مربوط ہیں۔

۴۔ متنی ساخت:

کوئی بھی متن وہ تمام مذکورہ خوبیوں سے مل کر بنتا ہے۔ ان تمام خوبیوں کو متنی ساخت کہتے ہیں۔ لیکن تنقیدی تجزیہ کلامیہ میں ہم ظاہری ساخت کی بجائے متن جس ڈسکورس کے لیے تخلیق ہوا ہے اس کے تناظر میں اس کی معنوی ساخت دیکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا مراحل کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کتنے ل کے قابل ہو جاتے ہیں کہ متن کا اس کے پیداواری ذرائع، قاری اور ڈسکورس کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

"By system of formation, then, I mean a complex group of relations that function as a rule" (۱۳)

اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے افغان جنگ کے دوران اسلامی ادب مغرب سے چھپ کر جہادیوں میں تقسیم ہو تا رہا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ متن کا تعلق افغان مجاہدین کے عقائد کے ساتھ ہے جب کہ اس کے پیداواری ذرائع مغرب میں ہیں۔ لیکن ڈسکورس میں رہتے ہوئے لوگ اس تضاد پر سوچنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ کسی بھی ڈسکورس کی سب سے بڑی کامیابی بھی یہی ہے کہ اس کے زیر اثر لوگ اس ڈسکورس کے باہر سوچنے سے محروم ہو جائیں۔

سماجی سر گرمیاں(Social Practices)

تیسرے نمبر پر ہم کسی بھی ڈسکورس کے نتیجے میں پیدا یا تبدیل ہونے والی سماجی سر گرمیوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ مشل فوکو سماجی سر گرمیوں کے لیے کئی جگہ کلامیاتی سر گرمیاں (Discursive Practices) کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ کلامیاتی سر گرمیوں سے مراد وہ تمام سر گرمیاں جو کسی ڈسکورس کی پیدا کردہ ہوں۔

یہ وہ مرحلہ ہے جس کے متعلق فوکو نے کہا تھا کہ ڈسکورس کا اثر مادی ہوتا ہے۔اس مرحلے پر ہم دیکھتے ہیں کہ مخصوص ڈسکورس کے تناظر میں لوگوں کی سماجی سر گرمیاں یا تو تبدیل ہو جاتی ہیں یا پھر ان میں نئی سماجی سر گرمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔یہ ڈسکورس کا تفہیمی مرحلہ ہے، جس میں ہم سماجی سر گرمیوں کا متن کے ساتھ باہمی تعلق کا جائزہ لیتے ہیں۔

"Explanation is concerned with the relationship between interaction and social context - with the social determination of the processes of production and interpretation, and their social effects". (۱۴)

ہمارے معاشرے وہ تمام باتیں اور افعال، جنہیں اس معاشرے کا ایک فرد روزانہ کی بنیاد پر سرانجام دیتا ہے۔ ان سب کا تعلق کسی نہ کسی ڈسکورس سے ہوتا ہے۔وہ باتیں یا افعال چاہے کتنے ہی غیر منطقی کیوں نہ ہوں، فرد کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں۔کیونکہ سماجی سطح پر فرد" ڈسکورس "کے اندر رہتے ہوئے باہر کی دنیا کو دیکھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے مختلف، مذہبی اور سیاسی ڈسکورس دیرپا ہوتے ہیں۔ یہ تمام ڈسکورسز زبان کے ذریعے طاقت حاصل کرتے ہیں۔کیونکہ زبان کے باہر کچھ بھی نہیں،انسان کی سوچ،افعال،تعلقات،جذبات سب کچھ زبان کے ذریعے ان تک پہنچتا ہے۔اس لیے زبان اور سماجی سر گرمیوں میں باہمی تعلق پایا جاتا ہے۔

"So, in seeing language as discourse and as social practice, one is committing oneself not just to analyzing texts, but to analyzing the relationship between texts, processes, and their social conditions................ and social structures. " (۱۵)

فیئر کلف کے نزدیک زبان کو ڈسکورس کے طور پر اور سماجی سرگرمی کے طور پر دیکھنے میں، صرف متن کا تجزیہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ متن، اس سے پیدا ہونے والی سرگرمیاں اور ان سے پیدا ہونے والے سماجی حالات کے درمیان تعلق کا تجزیہ کرنا بھی کرنا چاہیے۔ کیونکہ زبان ہی تمام طاقت کے دھاروں کو پیدا کرتی ہے اور انہیں طول دیتی ہے۔

لہٰذا، زبان کو ڈسکورس کے طور پر اور سماجی سرگرمیوں کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جس میں صرف متن کا تجزیہ کرنا کافی نہیں، بلکہ متن، اس کے پیداواری ذرائع اور اس متن سے پیدا ہونے والے سماجی حالات کے درمیان تعلق کا تنقیدی تجزیہ مقصود ہے۔

یہ بات بدیہی ہے کہ ہم جب بھی سوچتے ہیں تو کسی نہ کسی زبان میں سوچتے ہیں اور زبان الفاظ کا وسیع اور منظم مجموعہ ہے۔ دنیا کا کوئی بھی لفظ، جملہ یا بات بغیر کسی ڈسکورس کے موجود ہی نہیں۔ اس بابت فیئر کلف اپنی کتاب میں یوں لکھتا ہے۔

“The myth of free speech, that anyone is ‘free’ to say what they like, is an amazingly powerful one, given the actuality of a plethora of constraints on access to various sorts of speech, and writing”(۱۶)

جب کہ یہ بات ایک افسانہ ہے کہ کوئی بھی شخص اتنا طاقت ور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی پسند کی بات کرنے کے لیے آزاد ہے۔ ایسا ممکن ہی نہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی تحریر یا تقریر کو وجود دینے کے لیے بہت سارے مراحل اور رکاوٹوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد کوئی تقریر یا تحریر سامنے آتی ہے۔

عام طور پر ہمیں یہی لگتا ہے کہ ہم جو کچھ بھی سوچتے ہیں وہی بولتے ہیں یا لکھتے ہیں۔ کبھی ہم نے یہ نہیں سوچا کہ جب ہم کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں تو اس کے پیچھے بہت سارے سماجی اور نظریاتی فلٹرز کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ہماری کوئی بھی فکر ہو وہ ان فلٹرز سے گزر کر ہمارے شعور کا حصہ بنتی ہے، اس کے بعد تقریر یا تحریر کا۔

اس لیے سماجی سطح پر کوئی بھی لفظ جملہ یا نظریہ مقبول ہے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی ڈسکورس ضرور موجود ہو گا۔ اگر اس کے پیچھے کوئی ڈسکورس موجود ہے تو یہ بات بھی حقیقت ہے کہ وہ نظریہ کسی خاص مقصد کے حصول کے

لیے بنایا گیا ہے۔ جبکہ مقاصد کے حصول کے لیے کسی نہ کسی طاقت کے مرکز کی پشت پناہی لازمی ٹھہرتی ہے۔اس لیے ہمیں اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے نظریات کے جال اور ڈسکورس کا تنقیدی تجزیہ کرتے رہنا چاہیے۔ تاکہ معاشرے میں مسائل کم سے کم پیدا ہوں۔

فیئر کلف اس تھیوری میں کسی بھی متن کے سماجی سطح پر پیدا کردہ اثرات کا جائزہ لیتا ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ کسی بھی متن میں موجود عبارتیں اور اس کی قواعد کی خصوصیات کس طرح قاری کے ذہن کو مخصوص طریقوں سے تعمیر کرنے کے لیے کام کرتی ہیں۔اس طرح کسی بھی متن کو سمجھنے کے لیے سہہ جہتی تجزیے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تجزیہ متن میں موجود خصوصیات کو دیکھ کر شروع ہوتا ہے۔

مجموعی جائزہ

ہمارے ہاں زبان اور سماج کے مطالعے کو اس قدر اہمیت نہیں دی جاتی، جس قدر یہ مطالعہ اہمیت کا حامل ہے۔ جدید دنیا میں زبان کو بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے اور زبان کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کا سماجی، سیاسی اور معاشی استحصال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم زبان کے ذریعے انسانی ذہن میں نقب لگا سکتے ہیں، اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ پروپیگنڈہ جنگ میں زبان کے ذریعے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے بنایا گیا ذخیرہ الفاظ مسلسل دہرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سننے والا ذہن ان الفاظ کا اسیر ہو ان کے دائرے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی واضح اور قریب کی مثال افغان جہاد کی ہے۔ جہاں پاکستانی اور افغانی عوام میں جہادی ڈسکورس کو قائم کرنے کے لیے، جہاد، جنگ، قتال، کفار، اسلام، حق، باطل، تلوار، غزوہ، کلاشنکوف جیسا ذخیرہ الفاظ دیا گیا۔ ان الفاظ کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کتابوں، اخباروں، میگزین، میڈیائی چینلز، نصاب، مذہبی وسیاسی اجتماعات کی تقاریر میں بار بار دہرایا گیا، جس کی وجہ سے بہت ہی قلیل مدت میں، پوری قوم کے پاس سوچنے اور بات کرنے کے لیے ان الفاظ اور ان الفاظ سے پیدا ہونے والے موضوعات کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

جب اجتماعی طوپر ر قوم میں ایسے موضوعات پسندیدہ بن جاتے ہیں تو ان پر عمل کرنا مشکل نہیں رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان میں حجام کی دکان سے لے یونیورسٹیوں کے سیمینارز تک، ان موضوعات پر گفتگو ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ملک افغان جنگ کی بھٹی میں جلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ کیونکہ انہیں بہت تھوڑے عرصے میں وافر افرادی قوت مل گئی۔

مشل فوکو نے جدیدیت کے نظام کو توڑنے کے لیے ڈسکورس کا تجزیاتی مطالعہ وضع کیا تھا۔ جس میں پہلی بار مہا بیانیے ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ مشل فوکو سے پہلے، یہ مہابیانیے ناقابل تفہیم تھے، اس لیے یہ ناقابل شکست بھی تھے۔ فوکو نے آکر ایسے تمام مہابیانیے جھنجھوڑ کر رکھ دیے۔ گویا مشل فوکو نے طاقت کو چیلنج کیا، جو بااثر مقتدرات کو ہر معاشرے میں اور ہر دور میں حاصل رہی اور مشل فوکو علم کو طاقت کی خواہش کا مظہر کہتا ہے۔

بنیادی طور پر فوکو نے نظریات کی حدود سے باہر نکل کر ڈسکورسز کا تجزیہ کیا، جن کے سائے میں کئی نظریے سانس لے رہے تھے۔ ان نظریات کا تجزیہ کرنا آسان تھا، کیونکہ ان نظریات کا کوئی نہ کوئی مرکز ہوتا ہے، جس کو ڈھونڈ

کر ان نظریات کو ختم کر دیا جاتا تھا۔ مگر ڈسکورس کی سطح پر یہ کام اتنا آسان نہیں رہتا۔ کیونکہ کسی بھی ڈسکورس کا نظریات کی طرح طاقت کا کوئی ایک مرکز نہیں ہوتا اس لیے اسے آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ڈسکورس کو ختم کرنا تو دور کی بات ہے پہلے اس کو سمجھنا خاصا محنت طلب کام ہوتا ہے۔ پھر کسی بھی رائج ڈسکورس کو ختم کرنے کے لیے، اس کے مد مقابل ایک اور ڈسکورس پیدا کیا جاتا ہے۔ تب جا کر پہلے سے رائج ڈسکورس کو تبدیل یا ختم کرنا ممکن ہوتا ہے۔ یہ کام بہت زیادہ محنت اور خاصا وقت مانگتا ہے۔

مشل فوکو کے مطابق ڈسکورس ہمیشہ طاقت ور طبقہ بناتا ہے، تاکہ کمزور طبقے کا استحصال کیا جا سکے۔ ڈسکورس کو مضبوط کرنے کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ اسے بار بار دہرایا جائے۔ اس لیے طاقت ور طبقہ اس ڈسکورس کو بار بار دہراتا ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب یہ ڈسکورس اتنا طاقت ور ہو جاتا ہے کہ اپنے بنانے والوں کو زیر کر لیتا ہے۔

افغانستان میں شدت پسندی کو فروغ دینے والے ڈسکورس نے امریکہ اور یورپ کے لوگوں کو بھی متاثر کیا، وہ بھی اس ڈسکورس کے زیر اثر افغان جنگ میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نائن الیون کے بعد امریکہ اور یورپ میں مسلمانوں کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت بہت جلد مغربی شدت پسندی میں بدل جاتی ہے۔

مشل فوکو کے مطابق کوئی بھی انسانی فعل، ڈسکورس کے باہر نہیں ہو سکتا۔ ہمارا سوچنا، مذہبی و سماجی رسوم، غم و غصہ کا اظہار، محبت کے انداز، ثقافت، اجتماعی و انفرادی مزاج سب کچھ کسی نہ کسی ڈسکورس کے زیر اثر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جب ہم کسی ایک ڈسکورس کا تنقیدی جائزہ لے رہے ہوتے ہیں تب بھی ہم کسی دوسرے ڈسکورس میں بیٹھے ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

1. ا Hilary Janks, Discourse: Study of Cultural Politics, University of the Witwatersrand, Johannesburg, July 2006,p329
2. Norman Fairclough, Language and Power, Routledge London,2013, p7
3. Michel Foucault, The Archaeology of Knowledge, Routledge, New York 2002,p41,42
4. Michel Foucault, The Archaeology of Knowledge, Routledge, New York 2002,p135
5. Stuart Hall, Representation and The Media, Media Education Foundation,1997,p12
6. S Gill, Globalization, Market Civilization and Disciplinary Neoliberalism, (1995) 24 Millennium – Journal of International Studies, p399, 402.
7. Michel Foucault, The Order of Discourse, Routledge USA, 1981,p53
8. Michel Foucault, History of Sexuality, Pantheon books New York,1978,p176
9. Norman Fairclough, Language and Power, p3
10. Ibid, p54
11. Ibid, p62
12. Ibid,p64
13. Ibid,p70
14. Ibid,p72
15. Ibid, p92
16. Ibid, p97

باب دوم:

قلعہ جنگی اوراسی کی دہائی کے افغان جہادی کلامیہ کا تنقیدی جائزہ

روس اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ کا آغاز، دوسری جنگ عظیم کے اختتام پذیر ہوتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ اسی کی دہائی، امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جاری سرد جنگ کے عروج کی دہائی شمار ہوتی ہے۔

دوسری طرف نظریاتی دنیا میں یہ وقت مابعد جدیدت کے عروج کا ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت نے جہاں انسان کی سماجی و انفرادی زندگی کو سمجھنے کے لیے نئے زاویے نگاہ فراہم کیے، وہاں ریاست، مفاد، سماج، مذہب، یہاں تک کہ جنگ کے طریقہِ کار میں بھی جدت کو شامل کیا۔ اب جنگیں محض توپ اور ٹینکوں سے نہیں بلکہ نظریات اور پروپیگنڈہ سے لڑی جارہی ہیں۔ اس جنگ میں زبان سب سے اہم اور انتہائی مؤثر ہتھیار کے طور پر استعال ہو رہی ہے۔ زبان اتنی زیادہ اہمیت کی حامل کیوں ہے؟ اس کے لیے انسانی ذہن کی ساخت، سماجی سطح پر فرد کا مقام اور سماجی ساخت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اس دنیا میں انسانی ذہن واحد ایسی بے مثال چیز ہے، جو زمان و مکان کے دائرے کو بھی توڑ کر اس سے باہر نکل جاتی ہے۔ پھر بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسانی ذہن ایک چیز کے آگے ہمیشہ سر نگوں رہتا ہے اور وہ زبان ہے۔ چونکہ ڈسکورس زبان سے بنتے ہیں، اس لیے ہم ہمیشہ کسی نہ کسی لسانی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی ڈسکورس کے زیرِ اثر رہتے ہیں۔

اگر ہم ڈسکورس کی تعریف دیکھیں تو اس سے مراد کسی علم، فن، نظریے یا عقیدے کا ایسا جال جو اپنے اندر رہنے والوں کے اعمال اور افعال پر نہ صرف اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اپنی مخصوص ساخت کے مطابق عمل بھی کرواتا ہے۔ یعنی ڈسکورس سے مراد ایسا جال جس کے اندر رہتے ہوئے ایک فرد اپنی تمام زندگی اسی ڈسکورس کے طے شدہ معیارات کے مطابق بسر کرتا ہے۔

اگر ہم لسانی ڈسکورس کی بات کریں تو زبان بھی اپنا ایک ڈسکورس رکھتی ہے ہر لفظ کے مخصوص اور مختلف معنی ہوں گے انہیں کہاں کیسے اور کیوں ادا کرنا ہے اس کا فیصلہ ہم نہیں بلکہ وہ ڈسکورس کرتا ہے، ہم جس کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم کسی مذہبی ڈسکورس کی بات کریں تو، کوئی بھی شخص جو اس مذہبی ڈسکورس کے زیرِ اثر ہوتا ہے

،اس کے مذہبی متون، ڈسکورس کے متن کا فریضہ انجام دیتے ہیں، مولوی پنڈت اور پوپ، اس متن کے معلم کہلاتے ہیں جب کہ مذہبی رسوم اس متن کی تبلیغ کرتی ہیں اس کے علاوہ کوئی طاقت ور ادارہ جیسے "ریاست" اس مذہب کو طاقت فراہم کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ شخص اس مذہبی ڈسکورس کے مطابق سوچنے لگے گا اور اس کے افعال بھی اس ڈسکورس کے مطابق ہوں گے۔ افغان جہادی ڈسکورس بھی ایک مذہبی ڈسکورس سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اس لیے سوویت افغان جنگ میں تقدس کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔

اسی کی دہائی کے افغانستان کا تاریخی پسِ منظر:

اسی کی دہائی میں افغانستان ایک ایسی جنگ کا شکار ہوتا ہے جس میں غیر ملکی قوتوں کے مفاد زیادہ اور افغان قوم کے مفاد نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ پھر بھی افغانستان اس جنگ میں پورے جوش و جذبے سے شامل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت افغان معاشرہ ایک مخصوص ڈسکورس کے زیرِ اثر، حق اور باطل کی جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔ اس ڈسکورس کو اور اسی کی دہائی کے جہاد ہو سمجھنے کے لیے ہمیں افغانستان کی سیاسی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لینا پڑے گا۔

یوں تو تاریخ دان افغانستان کی تاریخ قبل از مسیح سے شروع کرتے ہیں۔ لیکن یہاں ہماری تحقیق کا بنیادی موضوع افغانستان کی تاریخ نہیں، بلکہ افغاستان کے ۱۹۸۰ء سے لے ۲۰۱۰ء تک کے سماجی اور سیاسی حالات، مستنصر حسین تارڑ کے ناول " قلعہ جنگی " کے تناظر میں بیان کرنا ہے۔ اس لیے غیر ضروری تفصیلات سے بچنے کے لیے ہم اس ناول کے تاریخی پسِ منظر کے طور پر پہلی اینگلو افغان جنگ سے لے بیسیوں صدی کے اختتام تک، افغانستان کے متعلق اہم واقعات کو مختصر بیان کریں گے۔

پہلی اینگلو افغان جنگ:

۱۳ جنوری ۱۸۴۲ کو، ایک برطانوی فوج کا ڈاکٹر، جلال آباد سے پشاور برطانوی سنٹری پوسٹ پر پہنچا، جو ان سولہ ہزار فوجیوں میں سے واحد زندہ بچ جانے والا برطانوی تھا، جنہیں برطانوی حکومت نے پہلی اینگلو افغان جنگ کے لیے افغانستان بھیجا تھا۔ ڈاکٹر برائیڈن نے ایک خوفناک کہانی سنائی۔ جس کے مطابق افغان جنگجوؤں کی بغاوت کے نتیجے میں برطانوی فوج کے سارے سپاہی مارے گئے۔

انیسویں صدی کے شروع میں روس نے وسطی ایشیا میں اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ ایسے میں برطانوی حکومت ہندوستان میں اپنے قبضے کے لیے فکر مند ہو گئی تھی کہ ہندوستان کو روس کی ممکنہ یلغار سے کیسے محفوظ رکھا جائے۔ لارڈ آکلینڈ اس وقت ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے اس خدشہ کا ادراک کیا۔ انہوں نے روس کی یلغار سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ سوچا کہ، اس وقت افغانستان کو سوویت یونین اور ہندوستان کے درمیان بطور حفاظتی دیوار استعمال کیا جائے۔ اس وقت افغانستان میں دوست محمد کی حکومت تھی۔ لارڈ آکلینڈ (Lord Auckland) نے دوست محمد کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، مگر دوست محمد نے اس کے لیے ایک شرط رکھی کہ برطانوی حکومت پشاوور کو رنجیت سنگھ سے واپس لینے کے لیے ان کی مدد کرے۔ جس پر کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

اس دوران روس نے ایران کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور اس کے علاوہ دوست محمد اور روس کے درمیان دوستانہ تعلق استوار ہونے لگے۔ جس کو دیکھ کر برطانوی حکوت نے، افغانستان میں دوست محمد کی جگہ شاہ شجاع کو افغانستان کا امیر مقرر کرنے کا سوچا۔ شاہ شجاع افغانستان کا سابقہ بادشاہ تھا، ۱۸۰۹ میں اس کا تختہ الٹ دیا گیا، جو اب برطانوی پنشن پر گزارا کر رہا تھا۔ برطانیہ نے دوبارہ شاہ شجاع کو افغانستان کا بادشاہ بنانے کے لیے دوست محمد کے خلاف بغاوت کو ہوا دی۔

شاہ شجاع سدوزئی قبیلے کا "بادشاہ" ہے، جس نے ۱۸۰۳ء میں کابل میں اقتدار پر قبضہ کیا۔ اس کی حکمرانی تقریباً چھ سال تک جاری رہی۔ کچھ عرصہ بعد اس کے خلاف بغاوت ہوئی تو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے پناہ دینے کی پیشکش کی۔ شاہ شجاع نے اپنا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ مگر ناکام رہا۔ شاہ شجاع کے جانے کے بعد، دوست محمد

خان نامی ایک شخص افغانستان میں بر سر اقتدار آیا، بالآخر اس نے خود کو امیر کا نام دیا اور سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔

شاہ شجاع کے بارے ولیم دالریمپل(William Dalrymple) نے یہ کہا :

"The "king" of the title is Shah Shuja of the Sadozai tribe, who seized power in Kabul in 1803. His rule lasted some six years, before the Barakzais .The British East India Company offered him asylum, and Shuja used that space to launch several failed attempts to regain his throne..."(۱)

۱۸۳۸ میں برطانیہ نے شاہ شجاع اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ مل ایک معاہدہ کیا، جس کے مطابق، برطانیہ ،شاہ شجاع اور مہاراجہ رنجیت سنگھ ،تینوں مل کر دوست محمد کی حکومت گرا کر دوبارہ اشاہ شجاع کو حکمران بنائیں گے، پھر افغانستان کی خارجہ پالیسی برطانیہ کے ہاتھ میں ہو گی۔ اس معاہدے کے فوراً بعد افغانستان پر حملہ کر دیا گیا۔اس جنگ کو پہلی اینگلو افغان جنگ کہا گیا۔جو ۱۸۳۹ سے ۱۸۴۲ تک لڑی گئی۔

۱۸۴۲ء میں برطانوی ہندوستان کی فوج کے کابل پر قبضہ کرنے کے بعد، دوست محمد نے برطانوی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ تاہم، کابل میں افغان بغاوت کے بعد انگریزوں کے پاس انخلاء کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ برطانوی فوج پر امیر دوست محمد کے بیٹے کی قیادت میں افغان باغیوں نے حملہ کر دیا۔برطانیہ کل ۲۰۰ فوجی مارے گئے۔

2. The British suffered 200 killed and wounded, while the Afghans suffered 500 killed and 1,500 captured. Ghazni was well-supplied, which eased the further advance considerably.

اس لڑائی میں صرف ایک آدمی،ڈاکٹر ولیم برائیڈن، فوجی تباہی کی تفصیلات بیان کرنے کے لیے بچ گیا۔افغانستان دوبارہ امیر دوست محمد کی بادشاہی میں چلا جاتا ہے۔اس طرح پہلی اینگلو افغآن جنگ کا اختتام ہزاروں جنگجوؤں کے قتل کی صورت میں ہوتا ہے۔

دوسری اینگلو افغان جنگ:

نومبر ۱۸۷۵ میں برطانوی وزیر اعظم بنجمن ڈزرائیلی نے لارڈ لٹن کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا۔ لیٹن کی تقرری کا مقصد افغانستان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات سے متعلق تھا۔ لیٹن تقرری کے وقت، افغانستان میں روسی اثر ورسوخ بڑھ رہا تھا، اور لیٹن کو اس کا مقابلہ کرنے یا طاقت کے ذریعے افغانستان کے ساتھ سرحد کو روسی خطرے سے محفوظ بنانے کے احکامات دیئے گئے تھے۔

لیٹن کے ہندوستان پہنچنے کے فوراً بعد، اس نے اس وقت کے افغانستان کے امیر شیر علی خان کو مطلع کیا، جو کہ دوست محمد کا تیسرا بیٹا تھا، جو اپنے والد کی وفات پر تخت پر بیٹھا تھا، کہ وہ کابل میں ایک "مشن" بھیج رہا ہے۔ جب امیر نے لیٹن کو افغانستان میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ،تو لیٹن نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ اعلان کیا کہ افغانستان صرف "دو دھاتی برتنوں کے درمیان ایک مٹی کا ٹکڑا" ہے۔ تاہم، اس نے سلطنت کے خلاف ۱۸۷۸ تک کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس کے برعکس انہی دنوں روس نے اپنا مشن افغانستان بھیج دیا۔ شیر علی نے روس کے مشن کو افغانستان میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن برطانیہ کو مشن بھیجنے پر سختی سے منع کر دیا۔

وائسرائے لٹن نے پھر افغانستان کو طاقت کے زور پر زیر کرنے کا سوچا، اور ۲۱ نومبر ۱۸۷۸ کو برطانوی حملے کے ساتھ دوسری اینگلو افغان جنگ کا آغاز کیا۔ شیر علی ۱۸۷۹ کے اوائل میں جلاوطنی میں مرتے ہوئے اپنے دارالحکومت اور ملک سے فرار ہو گئے۔ برطانوی فوج نے پہلی جنگ کی طرح کابل پر قبضہ کر لیا اور ۲۶ مئی ۱۸۷۹ کو گندمک (گندمک) میں ایک معاہدے پر دستخط کیے گئے۔ جس میں شیر علی کے بیٹے یعقوب خان کو افغانستان کو نیا امیر بنا دیا۔ خان صاحب بطور امیر کابل میں مستقل برطانوی سفارت خانہ کھولنے پر راضی ہو گئے۔ اس کے علاوہ، اس نے برطانوی حکومت کی "خواہشات اور مشورے" کے مطابق دیگر ریاستوں کے ساتھ اپنے خارجہ تعلقات کو چلانے پر بھی اتفاق کیا۔

تاہم، یہ برطانوی فتح قلیل المدتی تھی۔ ۳ ستمبر ۱۸۷۹ کو برطانوی ایلچی سر لوئس کاوگناری اور اس کے محافظ کو کابل میں قتل کر دیا گیا۔ برطانوی افواج نے قبائیلیوں پر دوبارہ حملہ کیا اور اکتوبر کے آخر تک انہوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ یعقوب خان نے تخت دستبردار ہو گیا، جو جولائی 1880 تک خالی رہا، جس کے بعد شیر علی کے بھتیجے عبدالرحمٰن امیر

بنایا گیا۔ عبد الرحمن کے دور میں جدید افغانستان کی سرحدیں انگریزوں اور روسیوں نے کھینچی تھیں۔ اسی دور میں معاہدہ ڈیورنڈ کے مطابق، ہندوستان اور افغانستان کے بیچ سرحد کو ڈیورنڈ لائن کہا گیا۔

تیسری اینگلو افغان جنگ:

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴–۱۸) کے آغاز کے ساتھ ہی، افغانستان میں برطانیہ کے خلاف عثمانی ترکی کی وسیع حمایت تھی۔ تاہم، اس وقت افغانستان کے حکمران، حبیب اللہ خان، اس پوری جنگ میں افغانستان کی عدم شمولیت کی پالیسی کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ جب حبیب اللہ کو ۲۰ فروری 1919 کو برطانوی مخالف تحریک سے وابستہ افراد نے قتل کر دیا تو ، ان کے بیٹے امان اللہ خان نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت بھی برطانیہ کو افغان معاملات میں اہم خاصا اثر ورسوخ حاصل تھا۔ اپنی تاجپوشی کے وقت خطاب میں امیر امان اللہ نے برطانیہ سے مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ اس اعلان نے مئی 1919 میں نتیجہ خیز تیسری اینگلو افغان جنگ کا آغاز کیا۔

ڈیورنڈ معاہدے کی مدت بادشاہ امیر عبدالرحمن کی زندگی تک تھی، جب وہ فوت ہوئے تو ان کے بیٹے امیر حبیب الرحمن نے انہی شرائط پر معاہدے کی تجدید کی۔ امیر حبیب الرحمن جب فوت ہوئے تو امیر امان للہ نے 1919 میں تیسری افغان اینگلو وار کے اختتام پر نیا معاہدہ کیا اور پہلی بار ڈیورنڈ لائن کو باقاعدہ بین الاقوامی سرحد تسلیم کیا۔ اسی معاہدے کی بنیاد پر امیر امان للہ موجودہ افغانستان کا بابائے قوم ٹھہرا اور ہر سال افغانستان کا قومی دن بھی اس معاہدے کی مناسبت سے منایا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد بھی ۱۹۴۷ تک افغانستان نے انگریزوں کے ساتھ کئی معاہدے کئے جن میں وہ مسلسل ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرتے رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد کا افغانستان:

انیس سو سینتالیس کے بعد ، دنیا کے حالات تیزی سے بدلے،عالمی منظر نامے پر برطانیہ ،فرانس،روس اور جرمنی کی جگہ امریکہ واحد سپر پاوور بن کر سامنے آیا۔ان حالات میں میں افغانستان میں بھی نئے مسائل نے جنم لیا۔برطانیہ نے افغانستان میں جاتے جاتے قوم پرستی کا بیج بو دیا تھا۔جس کے ساتھ بہت سارے مسائل پیدا ہو گئے تھے ۔سینتالیس کے بعد افغانستان میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے حوالے سے جن لوگوں کا زیادہ عمل دخل رہا ہے،ہم مختصراً ان کا ذکر کرتے ہوئے افغانستان کی اگلی پانچ دہائیوں کا خاکہ پیش کریں گے۔

سردار داؤد افغانستان میں موجود ان چند لوگوں میں شامل تھا جو جدید تعلیم سے آراستہ تھے۔ سردار داؤد بنیادی طور پر روس نواز ذہن کا حامل تھا۔وہ افغان بادشاہ ظاہر شاہ کے فوجی لشکر کا کمانڈر تھا اور ظاہر شاہ کو اس کی قابلیت اور وفاداری پر پورا بھروسہ تھا۔ظاہر شاہ نے اس کی قابلیت اور وفاداری کو دیکھتے ہوئے،اسے ۱۹۵۳ میں افغانستان کا وزیر اعظم بنادیا۔سردار داؤد نے پہلی دفعہ افغانستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی کو باضابطہ طور پر تبدیل کرکے اسے روسی بلاک میں شامل کیا۔

پاکستان کے ساتھ ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ بھی سردار داؤد کا پیدا کردہ ہے،وہ قیام پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ میں وزیر دفاع تھے اور افغانستان پر پشتونوں کی حکمرانی بر قرار رکھنے کیلئے اُس وقت باچاخان کی آزاد پشتونستان کے مطالبے کی حمایت کر رہے تھے۔ سردار داؤد ڈیورنڈ لائن ختم کرکے پاکستان کے پشتون علاقوں کو افغانستان میں ضم کرنے کے زبردست حامی تھے اور اس مقصد کیلئے اُس نے ۱۹۴۷ ءمیں اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت پر اعتراض بھی کیا، پشتونستان کا جھنڈا لہرایا، ۱۹۴۹ میں پاکستان پر حملہ کیا،لویہ جرگہ بلایا، جس میں ہر سال ۳۱اگست کو پشتونستان ڈے منانے کا اعلان کیا۔

سردار داؤد نے اپنی وزارت عظمٰی کے دس برسوں میں افغانستان کو روسی کالونی بنانے کیلئے سر توڑ کوشش کی جس سے عوام میں اس کے خلاف نفرت بڑھتی چلی گئی،خود ظاہر شاہ نے جب محسوس کیا کہ سردار داؤد حد سے تجاوز کر رہا ہے تو اس نے مارچ ۱۹۶۳ میں سردار داؤد کو وزارت عظمٰی سے ہٹا دیا۔

ظاہر شاہ نے ۱۹۷۳ء میں اعلان کر دیا کہ اس سال اسمبلیوں کی مدت ختم ہونے پر عام انتخابات ہوں گے۔ وہ جولائی میں یورپ کے دورے پر نکل گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں سردار داؤد کو افغانستان کے تخت پر قبضہ کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اس نے روس سے بڑی مقدار میں جدید اسلحہ حاصل کی اور روسی حکومت کی حمایت بھی حاصل کر لی۔ روسی حمایت کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ روس اپنے فوجی بھی سردار داؤد کی مدد کے لیے افغانستان بھیجے گا۔

۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو ظاہر شاہ اٹلی کے دورے پر تھا جب اسے خبر ملی کہ سردار داؤد نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ سردار داؤد نے اس دن فوج کی مدد سے کابل کے اہم سیاسی عمارتوں اور طاقت کے مراکز پر قبضہ کر لیا۔ کسی خون خرابے کے بغیر سردار داؤد چند گھنٹوں میں افغانستان کا بادشاہ بن گیا۔

نور محمد ترکئی غزنی کے ایک عام گھرانے میں پیدا ہوئے جن کا آبائی پیشہ چرواہی تھا۔ وہ بڑے فخر سے بتاتا تھا کہ اس کا سن پیدائش ۱۹۱۷ء ہے جو روس میں "بالشویک انقلاب" کی کامیابی کا سال ہے۔ نور محمد ترکئی نے اکتیس سال کی عمر میں "بیدار نوجوان" نامی ایک تحریک شروع کی اور انگارا کے نام سے جریدہ بھی شائع کرنے لگا۔ ۱۹۵۵ء میں اسے کابل کے امریکی سفارتخانے میں ملازمت مل گئی۔ ساتھ ساتھ انقلابی مواد پر مبنی تصانیف کا سلسلہ بھی جاری رہا اور یوں وہ کمیونزم کے پیروکاروں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے راہنماؤں میں شامل ہو گیا۔ افغانستان میں آہستہ آہستہ کمیونسٹ منظم ہوتے گئے اور جب ۱۹۶۵ء میں "افغانستان کمیونسٹ پارٹی" قائم ہوئی، تو نور محمد ترکئی اس کا پہلا جنرل سیکرٹری مقرر ہوا۔ کچھ عرصے بعد ببرک کارمل سے اختلافات کے باعث پارٹی تقسیم ہوئی تو ترکئی نے "خلق" اور کارمل نے "پرچم" کے نام سے الگ الگ پارٹیاں بنالیں۔

ترکئی نے ۱۹۷۳ء میں ظاہر شاہ کو ہٹانے اور افغانستان میں بادشاہت کا خاتمہ کرنے میں سردار داؤد کا ساتھ دیا تھا، وہ کچھ عرصہ سردار داؤد کی حمایت بھی کرتا رہا، لیکن بعد میں ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ اختلاف وقت کے ساتھ ساتھ شدید ہوتے گئے، حتیٰ کہ سردار داؤد نے کمیونسٹوں کی دونوں پارٹیوں خلق اور پرچم پر ۱۹۷۷ء میں پابندی لگادی۔ اس پابندی کے بعد ترکئی اور کارمل نے سردار داؤد کو ہٹانے پر متحد ہو گئے۔

چند ماہ بعد ۱۷ اپریل ۱۹۷۸ء کو "پرچم پارٹی" کے راہنما اور "پرچم اخبار" کے ایڈیٹر میر اکبر خیبر کو، کابل میں قتل کر دیا گیا۔ جس کا الزام کمیونسٹوں نے سردار داؤد پر لگایا اور حکومت کے خلاف مظاہر شروع کر دیئے۔ اگلے ایک

ہفتے میں یہ مظاہرے اتنے شدید ہوگئے کہ ۲۸ اپریل ۱۹۷۸ء کو سردار داؤد کو صدارتی محل میں دن دیہاڑے اس کے خاندان سمیت مار دیا گیا اور حکومت پر کمیونسٹوں نے قبضہ کرلیا ۔ جس کا چیئرمین نور محمد ترکئی اور ڈپٹی چیئرمین ببرک کارمل بن گیا۔ اس حکومت کو سب سے پہلے روس نے تسلیم کیا۔

کچھ عرصے بعد ملک میں ترکئی حکومت کے مظالم کے خلاف بغاوت شروع ہوجاتی ہے۔ یہ بغاوت آہستہ آہستہ جہاد بن کر سامنے آتی ہے۔ جہادی تنظیموں کی کاروائیوں اور عوامی غم وغصے کے دوران ترکئی اور حفیظ امین کے اختلافات بھی شروع ہوگئے۔ یہ اختلافات اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ ترکئی کھلے عام امین کو سی آئی اے کا ایجنٹ کہتا تھا۔ امین حفیظ نے فوج، پولیس اور کابینہ کے اکثر عہدیداروں کے اپنی حمایتی بنار کھا تھا۔ جب ترکئی کو اس چیز کا احساس ہوا تو اس نے روس کے کہنے پر امین کو برطرف کرنا چاہا، لیکن اس سے پہلے ۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ کو امین نے کابل کے صدارتی محل پر قبضہ کرکے ترکئی کو گرفتار لیا۔ گرفتاری کے بعد امین نے روس کو اعتماد میں لیا اور کچھ دنوں بعد ۸ اکتوبر ۱۹۷۹ میں کو ترکئی کے منہ پر تکیہ رکھ کر بیدردی سے مار ڈالا۔

امین حفیظ افغانستان کمیونسٹوں میں مقبول ہونے کے علاوہ امریکہ کے نزدیک بھی پسندیدہ مہرہ تھا۔ اسی وجہ سے نور محمد ترکئی بھی اسے خاص اہمیت دیتا تھا۔ ۱۹۷۸ ء میں جب افغانستان میں "انقلاب ثور" آیا تو، اس انقلاب میں امین کا کردار سب سے نمایاں تھا۔ ثور انقلاب کے چندماہ بعد خلق اور پرچم میں اختلافات پیدا ہوگئے، جو اس حد تک بڑھ گئے کہ خلق نے پرچم کو حکومت سے نکال دیا، پرچم کے سارے راہنما جلاوطن کردیئے گئے اور بہت سارے ماردیئے گئے۔ اب ترکئی اور امین سیاہ وسفید کے مالک بن گئے۔ امین حفیظ افغانستان کے ڈپٹی وزیراعظم بن گئے۔

ان کا ڈپٹی وزیراعظم بننا روسیوں کو ناگوار گزرا، روسی سفیر نے اسلم وطنجار، سید محمد گلابزئی اور شیر جان مزدوریار کو امین کے خلاف بڑھکانا شروع کیا۔ امین کی کابینہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو امین کے مخالف تھے۔ ان مخالفین کی وجہ سے امین اور ترکئی میں اختلافات شروع ہوگئے۔ روسی عہدیدار افغانستان کے دورے پر ترکئی سے ملتے مگر امین سے ملاقات نہ کرتے، ترکئی اور امین ایک دوسرے پر غیر ملکی امداد کے الزامات لگانے لگے۔ یہ اختلافات چندماہ کے اندر اس حد تک بڑھ گئے کہ ترکئی نے کے جی بی کے ساتھ ملکر امین کو اسلم وطنجار، مزدوریار، گلابزئی اور سروری کے

ذریعے مارنے کا پلان بنایا۔ لیکن یہ پلان اس لئے ناکام ہوا کیونکہ امین کو پولیس چیف کے ذریعے امین کو خبر مل چکی تھی۔ اس کے بعد ترکئی نے امین کو ڈپٹی وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کرنا چاہا، لیکن اس میں بھی ناکام رہا۔

جب ترکئی امین کا کچھ نہ بگاڑ سکا تو اس نے تعلقات معمول پر لانے کی کوششیں شروع کیں اور امین کو صدارتی محل میں ملاقات کی دعوت دی لیکن امین نے انکار کر دیا۔ بعد میں روسی سفیر کے کہنے پر امین ۱۴ ستمبر ۱۹۷۹ کو پولیس چیف تڑون اور انٹیلیجنس چیف نواب علی کے ساتھ صدارتی محل گئے، وہ جونہی محل میں داخل ہوئے تو محل کے گارڈز نے اُن پر اندھادھند فائرنگ شروع کی۔ پولیس چیف موقع پر مارا گیا۔ جبکہ امین زخمی ہو کر بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے وہ سیدھا وزارت دفاع کی عمارت میں داخل ہوئے اور فوج کو ترکئی کی گرفتاری کا حکم دیا۔ امین نے اسی دن شام تک فوج کی مدد سے ترکئی کو گرفتار کیا اور حکومت پر قابض ہو گیا۔ روس نے ترکئی کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن امین نے روسی دباؤ قبول نہ کیا اور بلآخر برژنیف کی بلواسطہ اجازت سے ۸ اکتوبر ۱۹۷۹ کو امین نے ترکئی کے منہ پر تکیہ رکھ کر دم گھٹنے سے مار ڈالا۔

روسی چونکہ امین کو سی آئی اے کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ اس لئے امین کو ہٹانے کیلئے دسمبر ۱۹۷۹ کے آخری عشرے میں روس کے جنگی طیارے کابل کے اوپر منڈلانے لگے اور بلآخر ۲۶ اور ۲۷ دسمبر کی درمیانی شب " تپہ تاج بیگ " پر حملہ کر دیا۔ یہ امین کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ جلاوطن کئے گئے ببرک کارمل اس رات وسط ایشیاء کے ریڈیو اسٹیشنز سے امین کی برطرفی کا اعلان کر رہا تھا۔ اگلی صبح کابل کی سڑکوں پر روسی ٹینک گشت کر رہے تھے، ببرک کارمل افغانستان کا صدر اور امین کو پھانسی پر لٹکانے کا اعلانات کیے جارہے تھے۔ حالانکہ وہ رات کی لڑائی میں پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔

ببرک کارمل نے ظاہر شاہ کو ہٹانے میں سردار داؤد کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ ۱۹۷۳ میں داؤد کے اقتدار پر قبضے کے بعد، امریکی سفارت خانے کی ایک کیبل میں کہا گیا کہ نئی حکومت نے سوویت طرز کی مرکزی کمیٹی قائم کی ہے۔ جس میں کارمل اور میر اکبر خیبر کو اہم عہدے دیے گئے ہیں۔ شروع میں داؤد اور پرچمیوں کے درمیان نیشنل فرنٹ کی حکومت کام کرتی نظر آئی، مگر بعد کے ادوار میں ۱۹۷۵ تک داؤد نے ایوان صدر کے انتظامی، قانون سازی اور عدالتی اختیارات کو بڑھا کر اپنی پوزیشن مضبوط کر لی اور پرچمیوں کو خود سے دور رکھنے کیلئے قومی انقلابی پارٹی (جو داؤد نے قائم کی تھی) کے علاوہ تمام جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے دیا اور کارمل کو حکومت کی نگرانی میں رکھا گیا۔

چیکو سلواکیہ میں جلاوطنی کے دوران کارمل نے حکومت میں موجود پرچمیوں کے ساتھ ایک نیٹ ورک قائم کیا۔ اس نے امین کا تختہ الٹنے کے لیے ۴ ستمبر ۱۹۷۹ کو بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ افغانستان میں اس کے سرکردہ ارکان قادر اور آرمی چیف آف اسٹاف جنرل شاہ پور احمد زئی تھے۔ بغاوت کی منصوبہ بندی عید کے تہوار کے موقع پر کی گئی تھی۔ یہ سازش اس وقت ناکام ہو گئی جب بھارت میں افغان سفیر نے افغان قیادت کو منصوبے کے بارے میں بتایا۔ امین نے جب ترکئی کو گرفتار کیا تو سوویت یونین نے فیصلہ کیا کہ امین کو ہٹا دیا جائے گا تاکہ کارمل اور ترکئی کی مخلوط حکومت کا راستہ بنایا جاسکے۔ تاہم امین نے چند دن بعد ترکئی کو قتل کر دیا۔ چند ماہ بعد ۲۷ دسمبر ۱۸۷۹ کو کارمل کی افغان عوام سے پہلے سے ریکارڈ شدہ تقریر تاشقند سے ریڈیو کابل کے ذریعے نشر کی گئی جس میں اس نے امین کو ہٹانے اور خود حکمران بننے کا اعلان کیا۔ اگلے دن وہ روسی ٹینکوں کے ہمراہ کابل آیا اور امین کو قتل کرنے کے بعد حکمران بن گیا۔

کارمل کا اقتدار پر قبضہ کرنے سے ملک میں بدامنی تیزی سے بڑھ گئی اور کابل میں دو بڑی بغاوتیں اور کئی مہینوں تک طلباء کا مشہور احتجاج ہوا۔ افغان عوام کا حکومت پر عدم اعتماد کارمل کے لیے ایک اور بڑا مسئلہ تھا۔ یہ بداعتمادی اُس وقت مزید بڑھی جب اس نے کہا تھا کہ وہ نجی سرمائے کی حفاظت کریں گے لیکن بعد میں یہ ایک جھوٹا وعدہ ثابت ہوا۔ سوویت طرز کے مزید اداروں کے متعارف ہونے سے بھی عوام کا حکومت پر عدم اعتماد میں اضافہ ہوا۔

خانہ جنگی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی سوویت افغان جنگ کے دوران ملک کا زیادہ تر بنیادی ڈھانچہ تباہ ہو گیا۔ معاشی سرگرمیاں رُک گئیں۔ کارمل دورِ حکومت میں تنازعات کی وجہ سے مجموعی قومی پیداوار (GNP) میں کافی کمی آئی۔ زراعت کا شعبہ تباہ ہو کر رہ گیا، صنعتوں کا نام ونشان نہ رہا۔ ادائیگیوں کا توازن جو داؤد خان کے دورِ حکومت میں بڑھتا گیا تھا، کم ہوا اور ۱۹۸۲ تک منفی ہو کر ستر اعشاریہ تین ملین امریکی ڈالر ہو گیا۔

خارجہ محاذ پر بھی کارمل روس کا کٹھ پُتلی ثابت ہوا، اس کے دور میں افغانستان اور پاکستان کے تعلقات دشمنی پر مبنی رہے۔ پاکستان میں افغان مہاجرین کی بڑھتی ہوئی تعداد نے پی ڈی پی اے کی حکمرانی کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا۔ سوویت یونین نے ۱۹۸۵ میں دھمکی دی کہ اگر پاکستانی حکومت نے افغان مجاہدین کی مدد جاری رکھی تو وہ پاکستان میں بلوچ علیحدگی پسند تحریک کی حمایت کرے گا۔

کارمل حکومت کی نااہلیوں اور ناکامیوں کو دیکھتے ہوئے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اس وقت کے جنرل سیکرٹری میخائل گورباچوف نے کہا" ابھی تک کوئی قومی یکجہتی نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کامریڈ کارمل ہماری مدد سے کابل میں بیٹھے رہنے کی امید کر رہے ہیں۔" کارمل کی پوزیشن اس وقت مزید کمزور ہو گئی جب سوویت قیادت نے اسے افغانستان میں ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھہرانا شروع کیا۔ روسی وزیر خارجہ آندرے گرومیکو نے ۱۹۸۲ میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے ساتھ کارمل کے استعفیٰ کے امکان پر تبادلہ خیال کیا۔ گورباچوف کا منصوبہ یہ تھا کہ کارمل کی جگہ ڈاکٹر نجیب اللہ کو لے آئے، اسد سروری بھی ایک بہتر امیدوار تھا۔ کیونکہ وہ پشتون، تاجک اور ازبکوں کے درمیان توازن قائم کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر نجیب کو نومبر ۱۹۸۵ میں PDPA سیکرٹریٹ میں تعینات کیا گیا تھا۔ کارمل کے مارچ ۱۹۸۶ کے سوویت یونین کے دورے کے دوران سوویت یونین نے کارمل کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا اور ان کی جگہ اقتندار ڈاکٹر نجیب کے حوالے کیا۔ اقتدار سے بیدخلی کے بعد کارمل کو اب بھی پارٹی کے اندر حمایت حاصل تھی اور اس نے ڈاکٹر نجیب کیلئے مسائل پیدا کرنے شروع کئے۔ انہوں نے یہ افواہیں پھیلانا شروع کر دیں کہ انہیں دوبارہ جنرل سیکرٹری مقرر کیا جائے گا۔ ڈاکٹر نجیب کی طاقت کا محور افغان خفیہ ایجنسی خاد تھا جو KGB کے انڈر تھا۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ سوویت یونین نے کارمل کی چھ سال سے زیادہ حمایت کی تھی۔ سوویت قیادت اسے بتدریج اقتدار سے باہر کرنا چاہتی تھی۔ افغانستان میں سوویت سفیر یولی ورونٹسوف نے ڈاکٹر نجیب سے کہا کہ وہ کارمل کی طاقت کو آہستہ آہستہ کمزور کرنا شروع کر دیں۔ نومبر ۱۹۸۶ میں PDPA کے ایک اجلاس نے کارمل کو اس کی انقلابی کونسل کی سربراہی سے فارغ کر دیا اور اسے ماسکو جلاوطن کر دیا جہاں اسے ایک سرکاری اپارٹمنٹ دیا گیا۔

اقتدار سے بیدخلی اور جلاوطنی کے کئی سال بعد انہوں نے ۱۹۷۸ کے ثور انقلاب کی غلطی تسلیم کی۔ اس نے ایک سوویت رپورٹر کو بتایا "افغانستان کے لوگوں کے خلاف سب سے بڑا جرم تھا"۔ وہ ۲۰ جون ۱۹۹۱ کو افغانستان واپس آئے اور کابل میں اپنے اپارٹمنٹ کو ڈاکٹر نجیب حکومت کی مخالفت کا مرکز بنایا۔ جب ۱۹۹۲ میں ڈاکٹر نجیب کا تختہ الٹ دیا گیا تو کارمل پرچم کی قیادت کے ذریعے کابل کا سب سے طاقتور سیاستدان بن گیا۔ تاہم مجاہدین کے ساتھ ان کے مذاکرات تیزی سے ختم ہو گئے۔ پھر ۱۶ اپریل ۱۹۹۲ کو گلبدین حکمت یار کی قیادت میں مجاہدین نے کابل پر قبضہ کر لیا۔

افغانستان اور جہادی ڈسکورس کی تیاری:

سوویت -افغان جنگ (۱۹۷۹-۱۹۸۹) ایک ایسا تنازعہ تھا جس میں باغی گروہوں نے، جنہیں اجتماعی طور پر مجاہدین کے نام سے جانا جاتا ہے، نیز مارکسسٹ، لیننسٹ ، ماؤسٹ گروپوں نے ڈیموکریٹک ریپبلک آف افغانستان (DRA) کے خلاف نو سالہ گوریلا جنگ لڑی ۔ دوسری طرف سوویت فوج ۱۹۸۰ کی دہائی میں اس جنگ میں براہ راست شامل ہو جاتی ہے۔ مجاہدین کو بنیادی طور پر امریکہ، پاکستان، ایران، سعودی عرب، چین اور برطانیہ کی طرف سے مختلف قسم کی حمایت حاصل تھی۔ یہ تنازعہ دراصل سرد جنگ کے دور کی پراکسی جنگ تھی۔ تقریباً دولاکھ کے قریب افغان مارے گئے اور لاکھوں لوگ پناہ گزینوں کے طور پر ملک چھوڑ کر بھاگ گئے، جن میں زیادہ تر پاکستان اور ایران گئے۔

وائس آف امریکہ کے مطابق ۱۹۷۹ سے لے کر ۲۰۲۰ تک افغانستان کی جنگ میں تقریبا ۲۴۰۰۰۰ کے قریب انسان ہلاک ہو چکے ہیں۔

“The Costs of War Project also estimates that 241,000 people have died as a direct result of this war. This includes at least 71,344 civilians; 2,442 American service members; 78,314 Afghan military and police; and 84,191 opposition fighters,” (۳)

اس جنگ کی بنیادیں ۱۹۷۸ میں افغانستان میں آنے والے ثور انقلاب کے ذریعے رکھی گئیں، جس میں افغانستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار سنبھالا، جس نے ملک بھر میں بنیاد پرست جدیدیت اور زمینی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ اصلاحات افغانستان کے دیہی علاقوں میں سختی سے رد کی گئیں۔ اس انقلاب کے ذریعے بننے والی حکومت نے بھرپور طریقے سے اپوزیشن کو دبایا اور ہزاروں سیاسی قیدیوں کو پھانسی دی، یہی بات حکومت مخالف مسلح گروہوں کے عروج کا باعث بنی۔ جس کے نتیجے میں اپریل ۱۹۷۹ تک، ملک اکثر علاقوں میں بغاوت شروع ہو گئی تھی۔ ملک میں مسلح گروپوں نے جہاد کا اعلان کر دیا جن میں گلبدین حکمت یار نے جماعت اسلامی، برہان الدین ربانی نے جمیعت اسلامی، مولانا محمد نبی نے حرکت اسلامیاور مولوی یونس خالص نے حزب اسلامی کی بنیاد رکھی۔

حالات زیادہ خراب ہوئے تو افغانستان کے جلاوطن سیاستدان ببرک کارمل نے روسیوں کے ساتھ مل کر امین حفیظ کا تختہ الٹ دیا اور روسی فوج اور ٹینکوں کے ساتھ افغانستان کے صدارتی محل پر قبضہ کرلیتا ہے۔

افغانستان میں جاری خانہ جنگی کو امریکہ کے علاوہ سعودیہ اور دوسرے تمام بڑے ممالک غور سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن ببرک کارمل کی روسی ٹینکوں کے ساتھ افغانستان میں آمد، امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ افغانستان کے متعلق جہادی ڈسکورس کی تشکیل یہاں سے ہوتی ہے۔ کیونکہ امریکہ کے لیے یہ بات باعث تشویش ہوتی ہے کہ افغانستان پر روسی نواز حکومت ہو گی۔ یہ وقت روس اور امریکہ سرد جنگ کا نقطہ عروج ہوتا ہے۔ اس لیے افغانستان میں روس و نواز حکمران ہونا امریکہ کے لیے ناقابل قبول بات تھی۔

امریکہ اپنے اتحادیوں کو اس بات پر راضی کرلیتا ہے کہ وہ افغانستان میں روس کو شکست دینے کے لیے اس کا ساتھ دیں۔ امریکیوں کے نے اس جنگ کو افغان خانہ جنگی کی بجائے اسلام اور سوشلزم کی جنگ بنا کر لڑنے کا فیصلے کیا۔ اس کام کے لیے اس نے سعودیہ اور پاکستان فرنٹ لائن اتحادی کے طور پر استعمال کیا۔

اس جنگ میں امریکی اتحادی بننے کے بدلے، صدر ضیاالحق نے امریکہ سے تین بلین ڈالر اور ایف سولہ کی ڈیمانڈ رکھی۔ جسے امریکہ نے کچھ لیت و لعل کے بعد قبول کر لیا تھا۔ سٹیو کول نے اس واقعہ کو اپنی کتاب میں اس طرح رقم کیا:

"He [Zia] turned down Carter`s initial offer of $400 million in aid, dismissin it as "peanuts" and was rewarded with $3.2 billion proposal from the Reagan administration plus to buy F-16 figter jets" (۳)

سعودیہ اور پاکستان کی اس جنگ میں شمولیت سے امریکہ کا پلڑا ابھاری ہو گیا۔ کیونکہ روس کے خلاف جنگ میں امریکہ اسلامی نظریات کو استعمال کرنے والا تھا۔ جس کے پروپیگنڈہ کے لیے امریکہ نے کئی بلین ڈالرز خرچ کیے۔ کیونکہ یہ تاریخ میں پہلی ایسی جنگ تھی جس میں ہر طرف جھوٹا پروپیگنڈہ، باقاعدہ پلاننگ کے تحت پھیلایا گیا۔ اس جنگ میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں اور اسلامی نظریے کا ہوا۔ اسلام کی غلط تشریحات کی بدولت عام مسلمانوں کو اس جنگ کا ایندھن بنایا گیا۔ جان بوجھ کر ایسے نام نہاد اسلامی مفکرین کی تحریروں اور کتابوں کو مقامی زبانوں میں ترجمہ کر کے مسلمانوں میں پھیلایا گیا، جو جہادی اور شدت پسند نظریات کے حامی تھے۔ جن میں سید قطب، ابو بکر نجدی اور ابو موسیٰ السوری قابل ذکر ہیں۔

اگر ہم ڈکورس کے مدارج کے تناظر میں بات کریں تو سب سے پہلا درجہ جہادی لٹریچر کی تخلیق کا آتا ہے۔ جس میں جہاد کے متعلق احادیث کو بنیاد بنا کر، اس کے متعلق لمبے چوڑے مضامین لکھے گئے، جہاد کی فضیلت اور اسلام کی متشدد تعبیر کے حوالے سے کئی کتابیں شائع کی گئیں، پھر ان کتابوں کو مقامی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ اس حوالے سے عرب متشدد سکالرز کی مدد لی گئی جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ سٹیو کول اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ سوویت افغان جنگ کے وران امریکہ نے قرآن اور دوسرے مذہبی لٹریچر کی پرنٹنگ کا خصوصی بندوبست کیا۔ اس کے لیے جرمنی کے پبلشنگ اداروں کی مدد لی گئی۔ سٹیو کول کہتا ہے کہ ان دنوں افغان مجاہدین کے ہاتھ میں سی آئی اے کے پبلش کردہ قرآن ہوتے تھے جنہیں ازبک اور دوسری مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ افغان جنگ کو حق و باطل کی لڑائی سمجھ کر لڑنے والوں مجاہدین کو اس کو اس بات کی خبر تک نہ ہو گی کہ ان کے ہاتھ میں سی آئی اے کے پبلش کردہ قرآن ہیں ۔ جنہیں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے اپنی مرضی کے تشریحات کر کے مجاہدین تک پہنچایا ہے۔

"Afghan rebels carrying CIA-printed Holy Koransin the Uzbek language secretley crossed the Ammu Dsrya River to mount sabotage and propaganda opertions inside Soviet Central Asia"(۴)

یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سوویت افغان جنگ کے دوران جتنا بھی مذہبی لٹریچر سامنے آتا ہے، وہ سی آئی اے کے پروپیگنڈہ کے تحت لکھا گیا۔ جس کی وجہ سے اسلامی تعلیمات میں شدت پسندی کو فروغ دیا گیا، نتیجتاً مسلمانوں کے لیے جہاد اور قتال میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ ہر مسلمان یہی سمجھ کر افغان جنگ میں شامل ہو رہا تھا کہ یہ معرکہِ حق و باطل ہے۔ بہت سارے مذہبی سکالرز نے اس جنگ کو جہاد اور غزوہ کا نام دیا۔ انہوں نے اپنے لوگوں کو کہا کہ اس جنگ میں شامل ہو کر لڑنا اب ہر مسلمان ہر فرض ہے۔ ساتھ میں جہاد کی فضیلتیں بیان کرتے، جس کی وجہ سے غریب مسلمان جن کی زندگی پہلے ہی عذاب تھی وہ جنت کی بشارتیں سن کر اس جنگ میں کود پڑے۔

جبکہ واشنگٹن پوسٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ سوویت افغان جنگ کے دوران پاکستانی اور افغانی مدارس کے لیے چالیس لاکھ کتب تیار کروائیں، جن کا ٹھیکہ امریکہ کی یونیورسٹی آف نبراسکا کو ملا۔ اس رپورٹ کے مطابق ان کتابوں میں اسلامی تاریخی اور فقہ کی کتب سے ایسے حوالے تلاش کر کے درج کیے گئے، جو اسلام کی جہادی اور متشدد تعبیر کو سپورٹ کرتے تھے۔

“Published in the dominant Afghan languages of Dari and Pashtu, the textbooks were developed in the early 1980s under an AID grant to the University of Nebraska. The agency spent $51 million on the university's education programs in Afghanistan from 1984 to 1994.”(۵)

اس ڈسکورس کے دوسرے مرحلے پر اس ڈسکورس کے مطابق لکھے گئے مواد کی مزید تشریح اور اس کی بار بار دہرائی کے لیے، عرب سے متشدد سکالرز، پاکستان اور افغانستان بھیج دیے گئے۔ افغان اور پاکستانی عوام میں بحیثیت مسلمان عربوں کی نسبت احساس کمتری کا جذبہ پہلے سے موجود تھا۔ جس کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا گیا۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ ہمارے ہاں خطہِ عرب سے منسلک ہر چیز کو برتر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کے مولویوں کی نسبت عرب مولویوں کا یہاں کی مقامی آبادی ر زیادہ اثر پڑتا۔ جس کو دیکھتے ہوئے ایک منصوبے کے تحت یہاں عرب کے متشدد سکالرز کو یونیورسٹیوں اور مدارس میں جگہ دی گئی۔ تاکہ وہ سی آئی اے کا مرتب کردہ متشدد مذہبی لٹریچر عوام میں بار بار دہرائیں۔

اس کے علاوہ پاکستان اور افغانستان کی مدارس میں بھی عرب متشدد مذہبی سکالرز تعینات کیے گئے۔ جنہوں نے وہاں کی سادہ لوح اور ان پڑھ عوام کے دماغ میں اسلام کی وہ شکل نقش کی جس کا تعلق جنگ، جہاد اور قتال سے تھا۔ دیہات کے لوگوں میں عرب اور عربوں سے مذہبی عقیدت کچھ زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان عرب مولویوں نے جہادی ڈسکورس کی تیاری میں اہم کردار ادا کیا۔

جب اسامہ بن لادن اور الظواہری نے یہاں ٹھکانہ بنایا، عبداللہ عظام اس وقت پشاور میں سب سے مشہور عرب اسلام پسند تھا۔ اس نے پشاور کے عرب اور اسلامی خیراتی اداروں کی کونسل چلانے میں مدد کی۔ مغربی کنارے کے شہر جنین کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا، عظام نے ۱۹۷۰ کی دہائی میں قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی سے اسلامی قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ مصری جلاوطن محمد قطب کے قریب ہو گئے اور قطب کے متوفی بھائی کے بنیاد پرست جہادی عقائد کی تبلیغ لگے۔ ۱۹۷۰ کی دہائی کے اواخر میں جدہ میں پڑھانے کے بعد، انہیں اسلام آباد میں اسلامک یونیورسٹی میں بطور لیکچرر تعینات کر دیا گیا۔

"After teaching in Jedda during the late 1970s, he transferred as a lecturer to the new Islamic University in Islamabad, down the hill from Quaid-I-Azam's campus. In 1984 he moved down the Grand Trunk Road to Peshawar" (۶)

اس طرح ایمن الظواہری، عبداللہ عظام اور بن لادن کے علاوہ دوسرے کئی عرب سکالرز پاکستان اور افغانستان پہنچ گئے۔ جنہوں نے یہاں اپنا اچھا تاثر قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے مدارس قائم کیے، فلاحی اداروں کی بنیاد رکھی، مساجد تعمیر کیں اس کے بعد جہادی ڈسکورس کی تبلیغ شروع کی۔ اس وقت تک لوگ ان کے سحر میں مبتلا ہو چکے تھے جس کی وجہ سے انہیں یہاں کی عوام کو جہاد کے لیے تیار کرنے میں زیادہ محنت نہ کرنی پڑی۔

اس طرح قلعہ جنگی کا مصنف یہاں کی مقامی ڈیموگرامی کی تبدیلی کا ذکر بھی کرتا ہے۔ جس کے مطابق یہاں ہزاروں عرب جنگجو اور مذہبی مبلغ آ نکلے۔ جنہوں نے اس علاقے کی، رسوم و رواج، اقدار، ثقافت سب کچھ تبدیل کر دیا۔

"ہزاروں عرب ادھر آ نکلے اور القاعدہ کے اسیر ہوئے۔" (۷)

اس ڈسکورس کے قائم ہونے کے بعد ایک ایسا معاشرہ تشکیل پاتا ہے جو اپنی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت گنوا چکا تھا۔ لوگ نہ صرف اس ڈسکورس کے مطابق سوچ رہے تھے بلکہ ان کی سماجی زندگی بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ ثقافتی تہواروں کی جگہ ایسے مذہبی تہوار رواج پا چکے تھے جن کا اسلام سے دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا۔ رقص، آرٹس، موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ بدعت اور کفار کا طور طریقہ ٹھہرے، ان کی جگہ کلاشنکوف، جنگ، تشدد، قتل، بم دھماکوں نے لے لی۔

ناول "قلعہ جنگی" کا تاریخی پسِ منظر:

اردو ادب میں تاریخی واقعات پر بہت کم ادب تخلیق ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو ادب میں موجود تاریخ کو مختلف سیاسی، سماجی اور معاشی تنقید کے تناظر میں پرکھنے کی روایت بھی مفقود ہے۔ میرا موضوعِ تحقیق چونکہ "قلعہ جنگی" میں بیان کردہ تاریخی واقعے کے پسِ منظر میں موجود ڈسکورس کا تنقیدی جائزہ لینا ہے، اس لیے ہم ناول میں موجود افسانوی تاریخ کو حقیقی تاریخی تناظر میں دیکھیں گے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "قلعہ جنگی" ۲۰۰۸ میں شائع ہوا تھا۔ جس میں سات لوگوں کی کہانی بیان ہوئی ہے، جو مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن یہ سب ایک ہی ڈسکورس سے متاثر ہو کر افغانستان میں جہاد کے لیے آتے ہیں۔

قلعہ جنگی کا واقعہ (جسے بعض اوقات "مزار شریف کی لڑائی" بھی کہا جاتا ہے) ۲۵ نومبر ۲۰۰۱ کو جنگی قیدیوں کی بغاوت کے بعد چھ روزہ خون ریز جنگ تھی۔ نائن الیون کے دھاکوں کے بعد امریکہ کی قیادت میں اتحادی افواج کی جانب سے طالبان کی امارت اسلامیہ افغانستان کو ختم کرنے کے لیے افغانستان پر جنگ مسلط کر دی گئی، طالبان حکومت پر الزام یہ تھا کہ وہ جو القاعدہ کے کارندوں کو پناہ دے رہی ہے۔

۴۰۰ سے زائد غیر ملکی جنگجوؤں نے مزار شریف کے باہر ہتھیار ڈال دیے اور انہیں افغان شمالی اتحاد کی افواج نے قلعہ جنگی میں رکھا، جہاں عبد الرشید دوستم کے انٹیلی جنس افسران اور سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی (سی آئی اے) کے اہلکاروں نے ان سے پوچھ گچھ کی۔ شمالی افغانستان میں شکست کا سامنا کرتے ہوئے ان جہادیوں نے رشید دوستم کے کمانڈر کے سامنے سرنڈر کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

"His surrender was negotiated at Qala-i-Jangi on November 21", (۸)

پوچھ گچھ کے دوران قیدیوں کو جب یہ لگا کہ انہیں کسی بھی صورت زندہ نہیں چھوڑا جائے گا، تو انہوں نے بغاوت کر دی۔ جس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے پورا قلعہ جنگی میدان جنگ بن جاتا ہے۔ گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ ہر طرف لاشوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اس بغاوت کے ابتدائی مناظر اس طرح پیش کیے۔

"بھگدڑ میں انہیں کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی۔۔۔۔۔۔۔۔ اور انہیں

یہیں گمان ہوا کہ وہ مر چکے ہیں اور موت کی تاریکی میں گر رہے ہیں"(۹)

دیکھتے ہی دیکھتے قلعہ جنگی میں ایک ہولناک جنگ چھڑ گئی۔ جب یہ جنگ شمالی اتحاد کے جنگجوؤں سے کنٹرول نہ ہوئی تو انہوں امریکہ کی مدد لی، جس کے نتیجے میں امریکہ بمبار طیارے قلعہ جنگ پر آگ برسانے لگے۔ اس دوران قلعہ جنگی میں بھگدڑ مچ گئی، تمام جنگجو اپنی جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے لگے، لیکن امریکی بموں سے بچنا محال تھا، اسی اثنا میں طالبان کے سات جنگجو کسی طرح، قلعہ جنگی میں موجوڈ تہہ خانے تک پہنچ جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول "قلعہ جنگی" کی شروعات یہاں سے ہوتی ہے۔

"قلعہ جنگی" کے کردار اور جہادی ڈسکورس:

مستنصر حسین تارڑ کے ناول "قلعہ جنگی" میں سات کردار ہے اور ان کے ساتھ ایک گھوڑا بھی ہے۔ گھوڑا ایک علامتی کردار ہے، جو پورے ناول میں تمام کرداروں کے ساتھ چلتا ہے۔ اس ناول میں مرتضی بیگ، چی چی ابو طالب، اللہ بخش، عبدالوہاب، گل شیر ولی اور ہاشم میر کے کردار موجود ہیں۔ یہ تمام لوگ مختلف علاقوں اور مختلف ملکوں سے، افغانستان میں حق وباطل کی جنگ لڑنے آتے ہیں۔ سوویت افغان جنگ کے دوران امریکہ نے اپنے مفاد کے حصول کے لیے اسلام کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کا سوچا، جس کے لیے امریکہ نے پوری دنیا میں ایک جہادی ڈسکورس ترتیب دیا۔ قلعہ جنگی کے مصنف نے اس ڈسکورس کو سات کرداروں کے ساتھ پیش کیا۔ جن کا ہم الگ الگ مطالعہ کریں گے۔

مرتضیٰ بیگ:

ناول میں سب سے پہلے مصنف ہمیں مرتضیٰ بیگ کی کہانی سناتا ہے۔س میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ مرتضیٰ بیگ اس ڈسکورس کا شکار کیسے بنا۔مرتضیٰ بیگ ایک پاکستانی جنرل ارتضیٰ بیگ کا بیٹا ہے۔افغان سوویت جنگ میں جنرل ارتضیٰ بیگ سی آئی اے کے ساتھ کام کرتا ہے اور وہ بیرون ملک سے آیا اسلحہ بارود افغان جنگوؤں تک پہنچاتا ہے۔اس کے ساتھ وہ ان جنگجوؤں کو امریکہ ڈالر بھی پہنچاتا ہے۔جنگ کی آڑ میں یہ ایک قسم کا کاروبار تھا۔ جس میں دنیا کے بڑے بڑے ڈیلرز شریک تھے۔اسلحہ بارود سے بھرے ہوئے ٹرک واپسی پر منشیات سے لوڈ ہو کر آتے ،جنہیں براستہ دبئی،یورپ اور امریکہ سمگل کیا جاتا۔اس دھندے میں بڑے بڑے بزنس مین شامل تھے جن میں کچھ کا تعلق بیرون ملک سے تھا۔ گویا دبئی اس جنگ میں ایک جنکشن کا کام دیتا ہے جہاں اسلحہ ،ڈلر اور منشیات تقسیم ہوتی ہیں۔اس وقت دنیا ٹاپ اسلحہ فروخت،منشیات فروش اور مختلف ممالک کی ایجنسیاں دبئی میں ملاقاتیں کرتی ہیں۔جہاں ڈالر، گولہ بارود اور منشیات کے بدلے افغانی اور پاکستانی عوام کا خون بیچا جارہا تھا۔

اس کاروبار میں سب سے زیادہ کمائی ایجنسیوں کی تھی جن میں سی آئی اے سرِفہرست ہے۔ان ایجنسیوں نے کروڑوں ڈالر کا مال کمایا جس کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مختلف ملکوں میں پراکسی جنگیں چھیڑنے میں استعمال کیا۔

تارڑ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"افغان سرحد سے واپسی پر یہ کنٹینر مکمل طور پر خالی نہ لوٹتے۔۔ان میں سفید
سفوف کی کچھ پوٹلیاں ہوتیں،جو ایک مرتبہ پھر جہلم اور گجرات کے درمیان ان کے
رفقاء کے حوالے کر دی جاتیں۔"(۱۰)

مرتضیٰ بیگ شہزادوں کی زندگی گزار رہا تھا،لیکن اپنے باپ کے بے جا دباؤ کی وجہ سے اندر اندر بغاوت پر آمادہ ہو رہا تھا۔ان دنوں جہاد کا ہر طرف اتنا شور تھا کہ گلی گلی جہادی حدیثیں لکھی ہوئی ملتی تھیں،نائی کی دکان سے لے کر یونیورسٹیوں کے سیمینارز تک میں جہاد اور افغانستان کا تذکرہ بلند تھا۔یہ ڈسکورس اتنا طاقتور تھا کہ اس میں نہ صرف ملک کے پڑھے لکھے لوگ شامل تھے بلکہ ملک کی غریب عوام بھی افغانستان میں جہاد کے لیے تیار بیٹھی تھی۔بعض لوگ تو اٹھتے بیٹھتے اس جہاد کی تبلیغ بھی کر رہے تھے۔مرتضیٰ بیگ بھی اس طرح عام لوگوں کی تبلیغ سے جہاد کے لیے تیار ہوا۔

ہوا کچھ یوں کہ ایک دن مرتضیٰ بیگ نائی کی دکان سے حجامت بنوانے گیا تو، باتوں باتوں میں اس نے نائی سے یہ پوچھ لیا کہ اتنے دنوں سے تم کہاں غائب تھے۔ جس کے جواب میں نائی کہتا ہے کہ:

"میری زندگی نے کروٹ لی ہے۔ میں قبائلی علاقے میں گیا تھا جہاد کی ٹریننگ لینے۔"(۱۱)

مرتضیٰ بیگ پر نائی کی اس بات کا اتنا اثر ہوا کہ وہ سارا دن نائی کی باتوں پر غور کرتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ یہ بے چارہ غریب نائی بھی خدا کے دین کے لیے اپنی جان دینے کے تیار ہے تو وہ کیوں نہیں۔ بس پھر کیا ہوا مرتضیٰ بیگ نے واپس اپنے گھر آکر رات کو اس نائی کو فون ملایا اور اسے کہا کہ میں نے بھی جہاد کے لیے جانا ہے۔ میرے جانے کا بھی بندوبست کیا جائے۔

حجام کیونکہ پہلے جہاد کی ٹریننگ لے چکا ہوتا ہے اس لیے اس کے جہادی ٹریننگ کیمپوں کے اہلکاروں سے رابطے ہوتے ہیں۔ وہ فوراً ان سے رابطہ کرتا ہے اور مرتضیٰ بیگ کے لیے جہاد کی ٹریننگ کا بندوبست کرواتا ہے۔ مرتضیٰ بیگ اپنا ضروری سامان باندھتا ہے اور جہاد کے لیے چل پڑتا ہے۔

مرتضیٰ بیگ نے جہاد کی ٹریننگ لی اور اب ٹریننگ کیمپ سے باہر، جنگ کے حقیقی میدان میں کفار سے لڑنے کے لیے بے تاب تھا۔ جہاد کی ٹریننگ کے دوران اس کی مکمل برین واشنگ کی گئی، اسے طالبان اور القاعدہ کے بارے میں سچے مسلمان کی کہانیاں سنائی گئیں۔ اسے بار بار یہ بات بتائی گئی کہ یہ لوگ کفار کے خلاف اسلام کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جب کفر اور اسلام مدمقابل ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے لیے جہاد کرے اور اپنی جان پر کھیل کر خدا کے دین کو بچائے۔

حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ کوئی اسلام اور کفر جنگ نہیں تھی، بلکہ دنیا کی دو عالمی طاقتوں کا پاوور شو تھا۔ پاکستان اور افغانستان کی غریب اور سادہ لوح عوام اس جنگ کا ایندھن بن رہی تھی۔ مرتضیٰ بیگ نے بھی باقی نوجوانوں کی طرح ان کہانیوں کا سچا مان کر، دن رات ٹریننگ میں پسینہ بہایا، تاکہ وہ جلدی سے جلدی اپنی ٹریننگ مکمل کرے اور اس ٹریننگ کیمپ کی دیواروں سے آزاد ہو کر کفار سے لڑائی میں شامل ہو۔

ٹریننگ کے دوران ان جنگجوؤں کی برین واشنگ کو مصنف نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"اسے یقین دلایا جاتا کہ طالبان اسلام کے بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہو

کر ایک سچے اسلامی معاشرے کے لیے کوشاں ہیں ا ور ان کے جو بھی

مخالفین ہیں انہیں نیست ونابود کرنا عین جہاد ہے۔"(۱۲)

یہ مرتضیٰ بیگ کی کہانی ہے جو کہ ایک امیر گھرانے کا فرد ہے۔وہ بھی اس جہادی ڈسکورس کا شکار ہو جاتا ہے۔کیونکہ یہ ڈسکورس امیر غریب سب پر یکساں کنٹرول رکھتا ہے۔ مصنف نے مرتضیٰ بیگ کا کردار شامل کر کہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جہاد پر صرف غریب مسلمان نہیں جارہے تھے بلکہ اچھے خاصے امیر گھرانوں کے پڑھے لکھے نوجوان بھی اس راہ پر چل رہے تھے۔ اس بات سے ہمیں کسی بھی افغانستان کے لیے بنائے گئے جہادی ڈسکورس کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنا طاقتور ڈسکورس ہے۔

ابو طالب چی چی:

ابو طالب چی چی، چیچنیا کا رہنے ولا تھا۔ سوویت یونین نے اپنے عروج کے دنوں میں یہاں کی آبادی پر، صرف قبضے کی خواہش میں، جنگ مسلط کی تھی۔ جس کے رد عمل میں چیچنیا کی مسلمان آبادی روس کے خلاف تھی۔ افغان جہاد میں ان مسلمانوں کے انہیں جذبات کو استعمال کیا گیااور انہیں روس کے خلاف پرائی جنگ میں دھکیل دیا گیا۔

ماضی میں روسی قبضے کے دوران یہاں کی آبادی کو نکال کر روس کے دور دراز علاقوں میں بھیج دیا گیا تھا، تا کہ یہ لوگ بغاوت کے لیے اکٹھے نہ ہو سکیں۔ پھر اپنے علاقے میں واپس آنے پر بھی پابندی لگا دی۔ ان لوگوں سے اپنی زمینیں چھین کر انہیں دور دراز کی ریاستوں میں مہاجر کیمپوں میں ڈال دیا گیا۔

"جوزف سٹالن نے چیچنیا کے بیشتر آبادی کو زبردستی ٹرکوں پر ٹھونس کر

دور دراز کی سوویت ریاستوں میں بکھیر دیااور ان پر پابندی لگا دی کہ

وہ ان ریاستوں کے باہر کبھی بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔"(۱۴)

اس کی دادی نے سوویت ظلم و ستم دیکھ رکھے تھے جن کا ان کی شخصیت پر انتہائی گہرا اثر تھا۔اس کے علاوہ وہ امام شامل سے بہت زیادہ متاثر تھیں اور روس کے خلاف لڑنے کے لیے اپنے پوتے یعنی ابو طالب کو تیار کیا۔چیچنیا میں لوگ امام شامل کو اپنا ہیرو مانتے ہیں۔

داغستان میں ایک جنگجو کا گھر تھا جو اپنے مقام و مرتبے میں کہیں بڑا اور طاقتور تھا۔ان کا نام امام شامل تھا۔اور وہ ۱۸۰۰ کی دہائی میں داغستان سے ابھرنے والے عظیم جنگجوؤں میں سے ایک تھے۔وہ ۱۷۹۷ میں داغستان کے گاؤں جمری میں ایک آوار خاندان میں پیدا ہوا تھا، ایسے وقت میں جب روس سلطنت عثمانیہ اور فارس میں پھیل رہا تھا۔ ان کا اصل نام علی تھا، وہ بچپن میں اکثر بیمار رہتا تھا، اور اس امید پر اس کا نام "شمل" رکھ دیا گیا، اس امید پر کہ ایک نیا نام اسے صحت بخشے گا۔ ایک نوجوان لڑکے کے طور پر، وہ اپنے دن قصبے کے شیخ کے پاس اسلامی علم حاصل کرنے میں گزارتے تھے۔ اور ۲۰ سال کی عمر میں وہ شام کا سفر کر چکے تھے اور کئی اسلامی علوم میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ داغستان وطن واپس آنے پر، وہ روسی افواج کے خلاف مزاحمت میں شامل ہو گیا جو اپنے ملک میں پھیلنا چاہتی تھیں۔ تاہم ۱۸۳۲ میں جمری کی لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد وہ صحت یاب ہونے کے لیے پہاڑوں کی طرف پیچھے ہٹ گیا۔ ۱۸۳۴ میں صحت یاب ہونے کے بعد امام شامل کو داغستانی فوج کا نیا امام اور رہنما مقرر کیا گیا۔ اپنے بلند پایہ قد، مضبوط تعمیر اور بے پناہ اسلامی علم کی وجہ سے اس نے تیزی سے اپنے لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔وہ پوری قفقاز میں مسلم صفوں کو تزویراتی طور پر دوبارہ منظم اور متحد کرنے میں بھی کامیاب رہا۔ شہر کے لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے اور ہمیشہ اپنے جنگجوؤں کو جگہ دینے کے لیے جلدی کرتے ۱۸۵۹ میں اندرونی قبائلی تنازعات کی وجہ سے اس کی مزاحمت آہستہ آہستہ کمزور ہو گئی اور بالآخر اسے روسی فوج نے پکڑ لیا۔ اسے روسی افواج نے قید کر لیا اور ماسکو کے قریب ایک چھوٹے سے شہر میں سخت نگرانی میں دس سال کی جلاوطنی میں رکھا۔ دس سال بعد انہیں زندگی میں دوسری بار حج کی اجازت مل گئی۔ اپنی زیارت کے بعد، اس نے مدینہ شہر کا دورہ کیا اور اس کے بعد وہیں ۱۸۷۱ میں وفات پائی۔ یہ امام شامل کی کہانی ہے۔

ایک دن ابو طالب سے اس کی دادی نے یہ کہا کہ:

"غزوہ اور جہاد کے نعرے ابھی فرسودہ نہیں ہوئے میرے بچے، امام شامل

میرے خواب میں آئے تھے اور وہ کہتے تھے کہ کوہستان کی حرمے اور ناموس

کو بچانے کے لیے گروزنی پہنچو۔"(۱۴)

گروزنی میں روس کے خلاف جنگ میں، عرب، افریقی، افغانی، پاکستانی مجاہدین بھی لڑ رہے تھے۔ ابو طالب اب ان مجاہدین کے ساتھ یہاں سوویت کے خلاف افغانستان میں جنگ لڑنے آ گیا تھا۔

ہاشم میر:

ہاشم میر پاکستانی نژاد برطانوی شہری ہے۔ پاکستان میں اس کا تعلق کشمیر سے ہے۔ اس کا باپ پیسہ کمانے کے لیے غیر قانونی طریقے سے برطانیہ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی شہریت حاصل کر لیتا ہے۔ جس کے بعد وہ معاشی طور پر مضبوط ہو جاتا ہے۔

ہاشم میر کے باپ کو اپنے بچوں میں کچھ خاص دلچسپی نہیں ہوتی، اسے بس پیسے سے غرض ہوتی ہے۔ جس کے لیے وہ کوئی بھی قانونی و غیر قانونی کام کر سکتا ہے۔

ہاشم میر پڑھائی کے لیے بریڈ فورڈ سے لندن منتقل ہو جاتا ہے۔ یہاں اس کی ملاقات ایک سعودی لڑکے سے ہوتی ہے۔ جس کا نام وہ ال منصور بتاتا ہے۔ ال منصور ایک باغی سعودی لڑکا ہوتا ہے جو سید قطب اور ایمن الظواہری سے سے بہت متاثر ہوتا ہے اور جہادی اسلام پر یقین رکھتا ہے۔ ہاشم میر کی روزانہ اسلامک سینٹر میں ال سعود سے ملاقات ہوتی۔ جہاں ال سعود ہاشم میر کا قرآن اور حدیث کا ترجمہ انگلش میں پڑھ کر سناتا تھا۔

جس کے بارے ہاشم میر کہتا ہے:

"اس نے مجھے اسلام کے اس تصور سے آگاہ کیا جس کی وسعت، کائناتی

سچائی اور فراخ دلی میرے گمان میں بھی نہ تھی۔"(۱۵)

ہاشم میر کے ذہن میں جو کامل مسلمان اور آفاقی سچائی کا خاکہ تھا، وہ یہاں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ کیوں کہ یہاں اسے نے دیکھا مسلمان کسی کفار کے خلاف نہیں، بلکہ دوسرے مسلمان کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہاشم میر کی برطانیہ کے ایک ایسے ماحول میں پرورش ہوئی ہے جہاں سوال کرنے سے کوئی منع نہیں کرتا، جبکہ یہاں ہاشم میر کو کسی عمل پر سوال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ روزانہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھ رہا تھا، یہاں کی عورتوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک اسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ کن اسلام پسندوں کے درمیان آ گیا ہے۔

گو کہ ہاشم میر اب اس جنگ سے تھک چکا تھا اور وہ جان گیا تھا کہ یہ لڑائی کوئی آفاقی لڑائی نہیں ہے، نہ ہی یہ لوگ اسلام کے درست پیروکار ہیں، لیکن وہ یہاں سے جا نہیں سکا۔

"اب میں طالبان کے لیے نہیں۔۔۔ تصور کامل کے حصول کے لیے نہیں۔۔۔ اپنے

بے لوث اور جاں نثار ہمراہیوں کی خاطر یہاں ہوں۔" (۱۶)

اللہ بخش:

اللہ بخش ایک پنجابی نوجوان ہے جو اپنی مسجد کے مولوی کی جہادی تقریروں سے متاثر ہو کر افغان جنگ میں شامل ہوتا ہے۔ اللہ بخش کا خاندانی مراثی کہلاتا ہے۔ یہ لوگ ہمارے معاشرے کا انتہائی غریب طبقہ ہوتا ہے۔ مذہب کے نام پر یہ لوگ زیادہ استعمال ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس اچھی زندگی گزارنے کے لیے سوائے مذہبی تسلیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ بخش ایک دفعہ جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد جاتا ہے، جہاں ایک افغانی آیا ہوا تھا جسے سب لوگ اللہ کا مجاہد بتا رہے تھے۔ اس افغانی نے بڑے دردناک قصے سنائے کہ افغانستان میں کفار بے چارے مسلمانوں پہ ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ اس نے جہاد کے متعلق چند احادیث بھی سنائیں، پھر سب کو جہاد کی دعوت دی۔ اللہ بخش بھی اس کی پرسوز اپیل پر لبیک کہہ بیٹھا۔ اس کے علاوہ اللہ بخش قلعہ جنگی کے صحن میں موجود دوسرے جنگوؤں کو بتاتا ہے کہ اسے ایک

"بونے" نے جہاد کے لیے بھیجا۔ اس بونے نے بھی اللہ بخش سے وہی کچھ کہا جو اس دن افغانی مجاہد کہہ رہا تھا۔ بونے نے اللہ بخش سے کہا:

"جب وہ بولا تو اس افغانی بابے کی آواز میں بولا، جو اس دین چندہ مانگنے آیا تھا۔

اس نے بھی وہی دردناک قصے سنائے، کافروں کے ظلم و ستم ی کہانیاں سنائیں،

شہادت کا مرتبہ بیان کیا اور کہنے لگا تم جہاد کرو اور اسلام پر قربان ہو جاؤ۔"(۱۷)

مستنصر حسین تارڑ نے یہاں علامتاً اس دور کے مولویوں کو بونے کہا ہے۔ جو لوگوں کو اسلام کے نام پر استعمال کر رہے تھے۔ اللہ بخش بھی انہیں بونوں کا شکار ہو کر یہاں آنکلا۔

اللہ بخش وہاں سب کچھ چھوڑ کر، اکوڑہ خٹک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں اکثریت اللہ بخش جیسے غریب نوجوانوں کی ہوتی ہے۔ جن کو تین وقت کا کھانا، کپڑے جوتے اور سب سے بڑھ کر عزت مل رہی تھی۔ یہاں کوئی انہیں کمی کمین نہیں سمجھتا تھا نہ انہیں اپنے طنز کا نشانہ بناتا تھا۔

اللہ بخش قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں موجود اپنے ساتھیوں کو، ٹریننگ کیمپ کے حالات اس طرح بیان کرتا ہے:

"ادھر ہمار پاس جتنے بھی ذرا سخت طبیعت والے مولوی اور مدرسوں

کے طالب علم ہیں، ان میں بڑی تعداد میرے جیسے کمی کمینوں

کی ہے۔۔۔۔ کیوں کہ ادھر روٹی پانی کا بندوبست ہو جاتا ہے۔"(۱۸)

افغان جہاد کے دوران سعودیہ کی فنڈنگ سے جگہ جگہ مدارس بن گئے تھے، جہاں سے غریب اور سادہ دیہاتی نوجوانوں کو جہاد کے نام پر ابھارا جاتا، انہیں افغانستان کے مسلمانوں کے دردناک قصے سنائے جاتے، روسیوں کے ظلم و ستم بیان کیے جاتے۔ پھر انہیں ٹریننگ کے لینے افغانستان کے ساتھ پٹھان قبائلی علاقوں میں بھیجا جاتا۔ جہاں انہیں کلاشنکوف سے لے کر توپ چلانے تک، سکھایا جاتا۔ افغان جنگ ختم ہوئی تع جب یہ لوگ اپنے اپنے معاشروں میں لوٹے تو وہاں یہ لوگ

ایک عام شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنے میں ناکام تھے۔ کیونہ ان لوگوں نے افغان جنگ میں اسلام اور مسلمان کا وہ تصور پڑھ اور دیکھ رہا تھا جو مغرب کا پیدا کردہ تھا۔ اس لیے ان جنگجوؤں کو اپنے لوگ دائرہ اسلام سے خارج نظر آنے لگے۔

اللہ بخش کا کردار اس ناول میں مرتضیٰ بیگ کے کردار کی نسبت ایک غریب پاکستانی کا کردار ہے۔ مرتضیٰ بیگ تو اپنے روحانی سکون کے لیے اس جنگ میں شامل ہوتا ہے مگر اللہ بخش کی کہانی سے کے برعکس ہے۔ اللہ بخش کسی عام پاکستانی کی تبلیغ سے اس جہاد میں شامل نہیں ہوتا بلکہ ایک افغانی مجاہد کے شعلہ فشاں بیان کو سن کر جہاد میں جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسرا یہ لوگ غریب تھے۔ زندگی سے ویسے ہی مایوس تھے جہاد کے نعرے نے ان لوگوں اپنی تمام زندگی کی محرومی کو ختم کرنے کا موقعہ دیا ہوتا ہے۔ جس کہ وجہ سے وہ اس جہاد پر نکل پڑتا ہے۔

عبد الحمید جانی واکر:

جانی واکر ایک امریکی نوجوان ہے۔ جس کا جہادی نام عبد الحمید رکھا گیا۔ وہ ایک یہودی نوجوان ہے، جدید امریکی معاشرے کا ایک فرد۔

لیکن سب اسے امریکی امریکی پکارتے ہیں۔ ناول "قلعہ جنگی" میں جانی واکر اور اس کے باپ کے درمیان مکالمے کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں اس کی کہانی شروع ہوتی ہے، جب جانی واکر اپنے باپ کو بتاتا ہے کہ اس نے عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ بعد میں جب اس کے افغانستان میں جہادیوں سے رابطے ہوتے ہیں، جس کے بعد وہ افغانستان جہاد کے لیے جانا چاہتا ہے۔ اس دوران جانی واکر اور اس کے باپ کے درمیان بڑے دلچسپ مکالمے ہوتے ہیں۔ جس میں تصور کامل، مہایانیے، مارکسزم، چی گویرا وغیرہ موضوع بحث بنتے ہیں۔

جانی واکر کا امریکہ میں افغان جہادیوں سے کیسے رابطہ ہوتا ہے، اس پر ناول میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ کیونکہ اس دور میں نہ تو انٹرنیٹ کی سہولت تھی اور نہ افغانستان میں لڑنے والے جہادی گروہوں کے پاس اور کوئی عوامی روبطے کا ذریعہ تھا۔ جبکہ یونائیٹڈ سٹیٹ انسٹیٹیوٹ آف پیس کی ایک تحقیق کے مطابق، سوویت افغان جنگ کے دوران جہادی

گروہ عوام سے رابطے کے لیے سیٹیلائٹ ٹی وی کا استعمال کرتے تھے، اس کے بعد مخصوص مدارس اور ان کے کارندوں ذریعے اپنی کاز کے لیے لوگوں سے رابطہ کرتے تھے:

"Al-Qaeda uses satellite television and ubiquitous user-generated content on the Internet to reinvigorate pan-Muslim identity with a vengeful, defiant underdog narrative in which Islam is under constant and global attack by a monolithic adversary."(۱۹)

امریکہ جو کہ خود اس جہادی ڈسکورس کا بانی تھا، اس کے اپنے شہری بھی اس کا شکار ہونے لگے۔ جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں افغانستان میں موجود بیرون ممالک کے جہادیوں کی ایک فہرست بنائی گئی۔ جس میں بڑے حیران کن اعداد شمار سامنے آئے۔ اس تحقیق کے مطابق کم از کم ۶۵۰۰ جہادی، یورپی ممالک سے افغانستان جا کر اسلامی جہاد میں شامل ہوئے۔ ان میں زیادہ تر کا تعلق، فرانس، بیلجیم، ڈنمارک، جرمنی، برطانیہ اور امریکہ سے تھا۔ جبکہ صرف امریکہ سے تقریباً ۲۵۰ سے ۳۰۰ کے لگ بھگ امریکی شہری افغانستان میں اسلامی جہاد میں شامل ہوئے۔

"The estimated number of foreign volunteers from Europe ranges from 5,000 to 6,000, most of them from France, Belgium, Germany and the United Kingdom, while U.S. officials speak of several hundred."(۲۰)

جانی واکر بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ جو کارپوریٹ کلچر سے پیدا ہونے والے باطنی کھوکھلے پن سے ڈر کر، آفاقی سچ کے لیے یہاں مرنے اور مارنے کے لیے آ گیا۔

ناول میں امریکی شہری کو شامل کرنا مستنصر حسین تارڑ کے ناول کا جہادی ڈسکورس مکمل کرتا ہے۔ کیونکہ فوکو کے ڈسکورس کے مطابق کوئی بھی ڈسکورس جب حد سے زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے تو اپنے بنانے والوں کو بھی اپنے زیرِ اثر لے آتا ہے، گویا یہ ڈسکورس اپنے بنانے والوں پر بھی غالب آ جاتا ہے۔ جیسے امریکی شہری جانی واکر کا جہادی ڈسکورس سے متاثر ہو کر افغانستان کی لڑائی میں شامل ہونا اس بات کا ثبوت ہے۔

گل شیر ولی:

گل شیر ولی پاکستان کے شمالی علاقہ جات کا ایک دیہاتی، غریب اور سادہ لوح پٹھان ہے۔ وہ دیر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا باپ وہاں کے مقامی نوابوں کے اصطبل میں کام کرتا ہے۔ گل شیر ولی نہایت غریب خاندان سے تعلق تھا، اس کے چھ بہن بھائی ہیں۔ گل شیر کو چھوٹی عمر میں روزگار کے مسائل کا سامنا کرنا، کیونکہ وہ ایک ایسے علاوہ میں رہ رہا تھا جہاں ذریعہ معاش نوابوں کی چاکری کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

افغان جہاد کے دوران سے زیادہ متاثر ہونے والا خطہ یہی ہے جہاں سے گل شیر کا تعلق ہے۔ یہاں بھی افغان جنگ کے حصہ داروں نے، مفاد پرست مولویوں کے ذریعے یہاں کی عوام کی برین واشنگ کی۔ یہ علاقہ چونکہ قبائلی پس منظر رکھنے والا علاقہ تھا جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ ان مفاد پرست مولویوں کی باتوں میں جلدی آجاتے۔

گل شیر ولی کے بقول انہیں پٹھان ہونے پر فخر کرنا سکھایا جاتا، اور یہ کہا جاتا کہ پٹھان انتہائی بہادر قوم ہے۔ یہ بات ایک حقیقت ہے کہ افغان جنگ کے دوران پٹھانوں کی بہادری کے مبالغہ آمیز قصے مشہور کیے گئے، جس کی وجہ سے سادہ لوح پٹھان نوجوان اس جنگ کا سب سے زیادہ ایندھن بنے۔ گل شیر کی زبانی ناول کا مصنف اس حقیقت کا پردہ کچھ اس طرح فاش کرتا ہے:

> ”یہ باہر کا انگریز لوگ جب ہمارے بارے کہانی بناتا ہے تو لکھتا ہے کہ پٹھان
>
> قوم بہت طاقتور اور مضبوط ہے اور کسی کے سامنے جھکتا نہیں۔۔۔۔۔۔پٹھان
>
> بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسے بنگال کا بھوکا اور غریب۔“(۲۱)

گل شیر اور اس کا باپ ایک نواب کے ہاں کام کرتے تھے۔ ایک دن نواب کے ملازم نے گل کے باپ کو نواب صاحب کے گھوڑے پر سواری کرتے ہوئے دیکھ لیا، پھر نواب کو جا کر بتایا۔ نواب نے گل شیر کے والد کو شرمناک سزا دی ساتھ نوکری سے بھی نکال دیا۔ کچھ دنوں کے بعد گل شیر کا باپ مر جاتا ہے۔ جس کے بعد ان کے گھر غربت اور افلاس بڑھ جاتی ہے۔

انہی دنوں گل شیر کی ملاقات ایک مولوی سے ہوتی ہے۔جو کہ یہاں نماز پڑھانے کے لیے آتا ہے۔وہ مولوی علاقے والوں کو جہاد کی ترغیب بھی دیتاہے۔ جس میں وہ جہاد کو سب سے بنیادی مذہبی فریضہ بتاتاہے۔لوگوں کو جہاد کی فضیلت بتاتاہے اور انہیں افغانستان جا کر اسلام کے نام پر جان دینے کی ترغیب بھی دیتاہے۔ مولوی صاحب طالبان اور اسلام کو ایک سکے کے دو رخ بتاتا ہے۔ دوران تقریر مولوی صاحب جوشِ خطابت میں یہ کہتا ہے اس وقت جو بھی مسلمان افغانستان میں کفر کے خلاف لڑنے والے افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ لڑنے کی تیاری نہیں کرتا وہ مسلمان ہی نہیں۔یہ ایک ایسابیان ہے جس پر کوئی بھی مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔گل شیر ولی کے بقول ان کا مولوی مسجد میں یہ کہتاہے؛

"وہ مسلمان نہیں جو طالبان کی مدد نہ کرے۔"(۲۲)

گل شیر بھی اللہ بخش کی طرح غربت کا مارا ہوا ہوتا ہے۔اسے بھی ٹریننگ کیمپ میں ملنے والا مفت کا بہترین کھانا، نئے کپڑے، بہترین جوتے اور عزت متاثر کرتی ہے۔اس ناول میں یک طرف انتہائی امیر اور حکمران طبقے کو پیش کیا گیا ہے جبکہ دوسری طرف پاکستان کے انتہائی پسے ہوئے غریب طبقے کو دکھایا گیاہے۔ دوونوں کے طرز زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن دونوں اس جہادی ڈسکورس کا حصہ بن جاتے ہی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ گل شیر ولی ٹریننگ کیمپ میں ملنے والے اچھے کھانے اور آرام دہ جوتوں اونئے کپڑوں کی بات کرتا ہے۔گل شیر ولی گل شیر کی اس سوچ کو مصنف اس طرح بیان کرتاہے:

"میرا یہ جو پاؤں ہے جس میں بوٹ ہے تو پہلے نہیں تھا، جہاد پر
آیا تو ملا۔۔۔۔ بچپن سے ننگے پاؤں پھرتا اور بوجھ ڈھوتا۔"(۲۳)

گل شیر کی طرح ہزاروں نوجوان جو غربت کے ہاتھوں مجبور تھے وہ اس جنگ کا ایندھن بننے لگے۔کیونکہ ان جیسوں نوجوانوں کو اس ڈسکورس کی دو چیزیں زیادہ متاثر کررہی تھی۔ایک تو انہیں مجاہد بننے کے بعد معاشرے میں عزت کا مقام مل رہا تھا اس کے بارے یہ لوگ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔کیونکہ یہ لوگ اپنے معاشرے کا انتہائی پسا ہوا طبقہ تھا جن کی سماجی سطح پر کوئی خاطر خواہ عزت نہیں تھی۔یہ ہمارے سماج کا مسئلہ ہے یہاں غریبوں کو ایسے ہین اچھوت تصور کیا

جاتا ہے۔ دوسری بات جو انہیں اس جہادی ڈسکورس کے توسط سے مل رہی تھی وہ شہادت کے بعد کی نعمتیں تھیں۔ جو ان لوگوں کی ساری زندگی کی محرومیوں کا صلہ ہو سکتی تھی۔

عبدالوہاب آل غامدی:

اس ناول میں عبدالوہاب ایک ایسا کردار ہے جو، قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں قید تمام جہادیوں سے زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ اس نے کیمبرج سے علم الانسان(Anthropology) کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ ناول میں اس تعلق کا سعودی عرب کی آل سعود سے دکھایا جاتا ہے۔ اس کا باپ دوسرے سعودی باشندوں کی طرح عیاش پرست انسان ہوتا ہے۔ عبدالوہاب اپنے باپ کی عیاشی کی بارے بتاتا ہے کہ:

"میرا باپ جس نے میرے ایسے درجنوں بچوں کا بیج مختلف بیویوں میں

ڈالا اور وہ کبھی کبھار ہمارے نام بھول جاتا تھا اور اپنے خادموں سے

پوچھتا تھا کہ یہ جو بیس برس کا ہے اس کا کیا نام رکھا۔"(۲۴)

عبدالوہاب کو امریکیوں سے بہت نفرت تھی۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے سوویت افغان جنگ کے دوران سعودیہ عرب میں ہر جگہ امریکی بیٹھے تھے۔ شاہی خاندانوں میں وہ کسی بادشاہ کی مانند بلائے جاتے، ہمارے داخلی و خارجی معاملات میں انہیں بے جا دخل حاصل تھا۔ سعودی بادشاہ اپنی اعوام کے لیے تو انتہائی سخت لیکن وہاں اگر کوئی امریکی یا یورپی آ جاتا تو وہ اس کے لیے موم کی طرح پگھل جاتے تھے۔

عربوں کے ذہن میں امریکیوں کے خلاف یہ نفرت سوویت جنگ کے بعد کھل کر دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ بہرحال عبدالوہاب امریکیوں کے بارے کہتا ہے:

"وطن ہمارا تھا لیکن حکمرانی ان کی تھی، فوجی اڈے ان کے تھے جن کے

جن کے اندر سعودی جنرل بھی نہیں جاسکتے تھے"(۲۵)

لیکن یہ پروپیگنڈہ نائن الیون کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ عرب ممالک میں سامنے آتا۔اس سے پہلے عرب بھی اس ڈسکورس کا شکار تھے جس کا شکار پاکستان کے نوجوان تھے، جس کے زیر اثر امریکہ اور یورپ کے کئی نوجوان اس جہاد میں شامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ عربوں کے شدت پسند مبلغ اسلام کے کام کو مصر، سعودیہ اور ترکی کے اداروں سے پبلش کرایا گیا، پھر انہیں پوری اسلامی دنیا میں، اسلام کی سچی تعبیر کے نام پر تقسیم کیا گیا۔امریکہ نے اسلام کی جہادی تعبیر کے لیے سید قطب، محمد عبدالاالسیلم فراج، ابو بکر نجدی، ابو مصعب السوری وغیرہ کے تحریروں کو بنیاد بنایا۔ان کے مطالعے سے تیار ہونے والے جہادی مواد کو دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کر لے شائع کیا گیا۔ مشل ڈبلیو ایس (Michayel W.S) اپنی کتاب میں جس کا عنوان ہے ڈی کوڈنگ القاعدہ(Decoding Al-Qaida) میں لکھتا ہے:

"Idealogy of Al Qaida Derive from Sayed Qutb and Muhammad Abd Al Salem Faraj, Abu Bakr Naji Writings and conspets, Abu Masab al Suri, Abdul al Aziz al Murqin" (۲۶)

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ افغان جنگ کا ماسٹر مائنڈ امریکہ تھا، عربوں نے بے پناہ پیسہ فراہم کیا اور پاکستان نے افرادی قوت مہیا کی۔ ان تینوں کی وجہ سے روس کو شکست ہوئی، افغانیوں کی کئی نسلیں اپاہج اور تباہ ہو گئیں، پاکستان میں کلاشنکوف کلچر کو فروغ ملا۔ جس کے نتیجے میں دہشت گردی کا وہ طوفاں آیا کہ ہزاروں بے گناہوں پاکستانیوں کو قتل کیا گیا۔ عرب بھی اپنی لگائی ہوئی آگ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ عراق، شام، لبنان ، یمن اور لیبیا میں شدت پسندی کو فروغ ملا، جہاں مذہب اور فرقے کی بنیادی پر لاکھوں بے گناہ عرب مارے گئے۔

کسی بھی ڈسکورس کو جب بار بار دہریا جائے تو پہلے سے زیادہ طاقتور بن کر سامنے آتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ ڈسکورس اپنے بنانے والوں پر بھی قابض ہو جاتا ہے۔امریکہ، پاکستان اور عرب اس کی بہترین مثال ہیں۔

حوالہ جات

1. William Dalrymple, Return of a King: The Battle for Afghanistan, Bloomsbury Publishing, 2013, p134
2. Husain Farrukh, Afghanistan in the age of empires: the great game for South and Central Asia. Silk Road Books. p. 81, 412

۳۔ ایاز گل، افغان وار رپورٹ، وائس آف امریکہ، ۱۶ اپریل ۲۰۲۱

4. Steve Coll, Ghost War, Penguin books, 2004, p42

5. Ibid, p90

6. Joe Stephen, The ABC`s of Jihad, Washington Post, 23March, 2002

7. Steve Coll, Ghost War, p141

۸۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۴۶

9. Toby Harden, First Casualty, p42

۱۰۔ مسنتصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، ص ۴۲

۱۱۔ ایضاً ، ص ۵۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۰

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۰۳

20. Colonel John M, Why youth join Al-Qaida, Special Report, United States Institute of Peace, May 2010

21. Paul Burke, Global Jihadist Terrorism, 2007, p07

۲۲۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، ص۱۳۲

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً

27. Michael W.S.Rayan, Decoding Al-Qaeda's Strategy, Columbia University Press, p26

باب سوم:

قلعہ جنگی اور مابعد نائن الیون دہشت گردی کا ڈسکورس

مستنصر حسین تارڑ کا ناول " قلعہ جنگی" دراصل نائن الیون کے بعد ہونے والے ایک واقعے پر لکھا گیا ہے۔ جس میں اُن سات جنگجوؤں کی کہانی ہے جو روس کے خلاف لڑتے ہوئے مجاہدین کہلاتے ہیں ،جب عالمی طاقتوں کے مفاد بدلے، تو نائن الیون کے بعد یہی جنگجو دہشت گرد کہلاتے ہیں۔

دوسرے باب میں ہم نے عالمی سطح پر بننے والے افغان جہادی ڈسکورس کو " قلعہ جنگی" کے تناظر میں جانچا۔ اس باب میں ہم نائن الیون کے بعد، افغانستان میں لڑنے والے جنگجوؤں کے لیے ایجاد ہونے والے دہشت گردی کے ڈسکورس کا، مستنصر حسین تارڑ کے ناول "قلعہ جنگی" اور " خس و خاشاک زمانے" کے تناظر میں تنقیدی جائزہ پیش کریں گے۔

تاریخی پس منظر:

امریکہ کئی وجوہات کی بنا پر افغانستان میں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ طالبان کے زوال کے فوراً بعد ترقی اور سلامتی میں کم سرمایہ کاری، وسائل کی کمی اور عراق پر امریکی قیادت کے حملے سے پیدا ہونے والی اشتعال انگیزی، نیٹو کی بدعنوانی، سی آئی کا طاقت ور مسلح جتھوں کے ساتھ معاہدے کرنا، افغانستان میں ہمسائیہ ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کی حد سے زیادہ مداخلت کو نہ روکنا، بالآخر امریکی جنگ کی سب سے بڑی تزویراتی ناکامی بن گئی۔

سن ۱۹۸۸ ءمیں جنیوا معاہدے کے بعد، جب افغانستان سے روس کی افواج کا انخلاء شروع ہوا تو، افغانستان کے مجاہدین نے نجیب کی کمزور اور کٹھ پتلی حکومت گرانے کیلئے لڑائی شروع کی، نجیب کو اپنی حکومت چلانے کیلئے روس سے امداد مل رہی تھی۔ اگلے چند سالوں میں جب سوویت یونین کا انہدام ہوا اور روس معاشی طور کمزور ہوا تو اس نے وسط ایشیائی ریاستوں کو آزاد کرنے کے ساتھ ساتھ افغانستان کی امداد بھی بند کر دی۔ امداد بند ہونے کی وجہ سے نجیب نے اپریل ۱۹۹۲ ءمیں استعفیٰ دے دیا اور حکومت چھوڑ دی۔ نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد لڑائی میں شامل مجاہدین کے درمیان حکومت بنانے کے لیے کسی فارمولے پر اتفاق نہ ہونے کے باعث، اقتدار کی جنگ شروع ہوئی ، جس نے دیکھتے

ہی دیکھتے خانہ جنگی کی شکل اختیار کرلی اور اگلے دو سال تک افغانستان مختلف مجاہد گروپوں کے درمیان واضح طور پر مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا:

۱۔ کابل اور اس کے زیر انتظام شمالی علاقے

۲۔ مشرقی افغانستان کے صوبے

۳۔ شمالی افغانستان

۴۔ شمال مغربی افغانستان

۵۔ خوست اور اس کے نواح میں پاکستانی سرحد سے متصل علاقے

۶۔ بامیان

۷۔ درہ کیان اور پل خمری

۸۔ مشرقی افغانستان میں صوبہ کنڑ

ان تمام گروہوں کو امریکہ، عرب اور دوسرے امریکی اتحادی ممالک کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ اس بات کا قلعہ جنگی میں بھی مستنصر حسین تارڑ ذکر کیا ہے۔

" امریکہ کی جانب سے مجاہدین کے آٹھ گروپوں کو آشیر واد حاصل تھی"(۱)

افغانستان میں جاری خانہ جنگی کو ختم کرنے اور انتخابات کے ذریعے پُر امن انتقال اقتدار کیلئے، لڑائی میں شامل مجاہدین کے درمیان کئی بار صلح کی ششیں ہوئیں، لیکن ناکام رہیں۔

اپریل ۱۹۹۲ء میں پشاور کے گورنر ہاؤس میں افغانستان میں لڑنے والے مجاہدین کے راہنماؤں کا طویل اجلاس ہوا، جس میں وزیر اعظم نواز شریف بھی موجود تھے، وہ اجلاس بھی بغیر نتیجے کے ختم ہوا۔

اس کے بعد ایک اور اجلاس پشاور میں ہوا، جس میں حکومت پاکستان اور سعودی عرب کی حکومت نے متفقہ طور پر امن معاہدے کی توثیق کی، جس میں مجددی کو دو ماہ کیلئے عبوری افغان حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ مجددی نے دو ماہ بعد

صدارت چھوڑ کر اقتدار ربانی کے حوالے کیا۔ جس نے چار ماہ کے اندر انتخابات کروا کر اقتدار منتخب حکومت کے حوالے کرنا تھا۔ لیکن ربانی ملک میں ہر طرف پھیلی خانہ جنگی کے باعث مقررہ وقت پر انتخابات کرانے میں ناکام رہا۔ جس کے نتیجے میں مزید انتشار نے جنم لیا۔

اس دوران پاکستان نے مختلف مذہبی رہنماؤں کے ذریعے مجاہدین کو کسی ایک بات پر اتفاق کرنے کے لیے ٹاسک دیے، لیکن سب ناکام رہے۔ نواز شریف، شاہ فہد، اعجاز الحق اور امریکی اہلکار بھی ان کوششوں میں شامل رہے کہ کسی طرح مجاہدین حکومت بنانے کے مسئلے پر کوئی معاہدہ کرلیں۔ مگر تمام کوششیں بے سود رہیں۔

صلح کی ان کوششوں کے دوران بھی مجاہدین کے مسلح دھڑے ایک دوسرے کے خلاف حصول اقتدار کے لیے مسلسل برسرپیکار رہے۔ جب صلح کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو، صلح کروانے والے رہنما مایوس ہو کر کنارہ کش ہو گئے، پھر ملک میں ایسا طوفان دہشت گردی آیا کہ، دور و دور تک کوئی مرکزی طاقت نہ رہی۔ ان حالات میں مجاہدین کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہ تھا، ان کے کمانڈروں نے جگہ جگہ اپنی چوکیاں بنالیں، سڑکیں بلاک کر دیں، جگہ جگہ ان سڑکوں پر زنجیریں لگا کر اپنی مرضی کا ٹیکس وصول کرنے لگے۔ ملک کے طول و عرض میں کسی قانون کا نام و نشان تک نہ رہا۔ بقول نجیب آغا:

"صرف کندھار سے سپین بولدک تک ۲۰ سے زائد زنجیریں تھیں"(۲)

ان حالات میں، افغان معاشرہ ان جرائم پیشہ افراد کے رحم کرم پر تھا۔ عام لوگوں کا نہ مال محفوظ تھا نہ عزتیں۔ یہ لوگ ڈاکے ڈالتے، رہزنی کرتے، عورتوں کو گاڑیوں سے اتار کر درندگی کا نشانہ بناتے اور انہیں، ان کے گھر والوں کے سامنے قتل کر دیتے۔ منشیات فروشی کا دھندہ عروج پر تھا، جس سے یہ نام نہاد مجاہدین خوب دولت اکٹھی کر رہے تھے۔ اس کمائی سے وہ کرائے کے قاتل اور غنڈوں کو بھرتی کرنے لگے۔ اس ظلم اور لاقانونیت کی وجہ سے عوام کا جینا دوبھر ہو گیا تھا۔

اپریل ۱۹۹۲ ء سے ۱۹۹۴ء کے آخر تک بدترین خانہ جنگی رہی، اس کے بعد افغانستان میں ایک نئی طاقت کا ظہور ہوتا ہے، جسے لوگ " طالبان " کہتے ہیں۔

ملا عمر کی قیادت میں یہ لوگ جرائم پیشہ افراد کے خلاف اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے دو تہائی افغانستان فتح کر لیتے ہیں۔ ملا عمر اور اس کے مدرسے کے طالب علموں نے افغانستان میں پہلی کاروائی ستمبر ۱۹۹۴ء میں کی، اور ستمبر ۱۹۹۶ء تک کابل فتح کر لیتے ہیں۔ طالبان حکومت بناتے ہیں تو ان کے ملک میں کثیر تعداد میں موجود غیر ملکی جنگجو بھی ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ غیر ملکی جنگجو القاعدہ کی چھتری تلے جمع ہوتے ہیں۔ جس کی سربراہی اسامہ بن لادن کر رہا ہوتا ہے۔ وقت گزرتا گیا، القاعدہ اور طالبان افغانستان میں مضبوط ہوتے گئے۔ بہت دفعہ ان دونوں جہادی گروہوں کے درمیان اختلاف بھی سامنے آتے ہیں۔ یہ اختلاف سیاسی سے زیادہ مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ غیر ملکی جنگجو مقامی پشتون جہادیوں کو کم تر مسلمان سمجھتے تھے۔ عرب کے یہ جنگجو احساس برتری کا شکار تھے جس کی وجہ سے یہ طالبان کے ساتھ کوئی مضبوط تعلق نہ بنا پائے۔

افغانستان میں ابھی طالبان کی حکومت نے اپنے قدم جمائے نہیں ہوتے کہ، اسی دوران امریکہ میں نائن الیون کا واقعہ رونما ہو جاتا ہے۔ اس حملے کا تعلق القاعدہ سے جوڑا جاتا ہے۔ جس کی بنا پر امریکہ اپنے اتحادیوں سمیت افغانستان پر حملہ کرتا ہے۔ الجزیرہ کی ایک رپورٹ کے مطابق اسامہ بن لادن نے اپنے ایک آڈیو پیغام میں اس حملے کی حمایت کی، لیکن اس آڈیو پیغام میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کیے، جس سے یہ ثابت ہو کہ حملہ القاعدہ نے کیا ہے۔ دی گارجین نے اسامہ بن لادن کے اس پیغام کا ترجمہ کر کے اسے تحریری انداز میں شائع کیا۔ جس کے مطابق:

"There is America, hit by God in one of its softest spots. Its greatest buildings were destroyed, thank God for that."(۳)

امریکہ نے افغانستان میں طالبان حکومت سے بن لادن کی گرفتاری اور اسے امریکہ کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ جسے طالبان کمانڈر ملا عمر نے مسترد کر دیا۔ ملا عمر نے امریکہ کو پیغام بھجوایا کہ وہ کسی بھی مسلمان کو امریکہ یا اس کے اتحادیوں کے حوالے نہیں کرے گا۔

امریکہ اور طالبان حکومت کے درمیان بن لادن کی حوالگی پر مذاکرات بھی ہوئے۔ پاکستان اور اس کی انٹیلی جنس ایجنسی نے نے ان مذاکرات کا بندوبست کروایا۔ لیکن یہ مذاکرات مسلسل ناکام رہے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، عالمی سطح پر افغان طالبان کے خلاف غصہ بڑھتا چلا گیا۔ نیویارک ٹائمز کا صحافی سٹیو کول اپنی کتاب میں اسامہ بن لادن کی حوالگی پر ملا عمر کا ردعمل یوں بیان کرتا ہے:

"Omar said he could not hand over Bin Laden to any non-Muslim authority" (۴)

ملا عمر اور ان کی جماعت کے اکثر مجاہدین نے القاعدہ کے ساتھ مل کر ایک طویل جنگ لڑی تھی۔ اس لیے ملا عمر کی جماعت میں القاعدہ اور اس کے سربراہ کے لیے ہمدردی کا پیدا ہونا فطری تھا۔ اس کے علاوہ ملا عمر چونکہ اسلامی نظام کا پابند تھا اور وہ مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق چلتا تھا۔ جب کہ القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے کا مطالبہ سامنے آتا ہے تو مجلسِ شوریٰ کے ممبران اس اقدام کی مخالفت کرتے ہیں۔ خود ملا عمر بھی اس بات کے حق میں نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کے اگر اسامہ بن لادن ان حملوں میں ملوث ہے تو مغربی ممالک اس کے ثبوت افغان حکومت کو فراہم کرے، پھر طالبان حکومت اسلامی قوانین کے مطابق اسامہ بن لادن پر مقدمہ چلائے گی اور انہیں اسلامی قوانین کے مطابق سزا دے گی۔ گو کہ ملا عمر کی بات مدلل تھی مگر مغربی ممالک اپنی طاقت کے نشے میں اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

جب اسامہ بن لادن کے مسئلے پر امریکہ اور طالبان حکومت کسی بات پر اتفاق نہ کر سکے تو حالات مزید خراب ہو گئے۔ آخر کار امریکہ نے ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو، افغانستان پر حملہ کر دیا۔

"The air war opened on the night of October 7 in Afghanistan" (۵)

اس طرح سوویت روس کے خلاف جنگ میں جن جنگجوؤں کا امریکہ اتحادی تھا، وہ اب ان کا دشمن بن کر آسمان سے آگ برسانے لگا۔ زمینی حقائق تیزی سے تبدیل ہونے لگے، وفاداریاں اور حمایتیں، مفاد بدلنے سے تبدیل ہونے لگیں، طاقت کے مرکزی دھارے تیزی سے بکھرنے لگے۔ ہر طرف انتشار پھیلنے لگا۔ طالبانوں پر امریکی حملے نے، افغانستان کو ایک ہی رات میں دوبارہ وہاں کھڑا کر دیا، جہاں سوویت حملہ آور ملک میں داخل ہوئے تھے۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے جہادی ڈسکورس کو دہشت گردی کے ڈسکورس میں کیسے تبدیل کیا، اس کے لیے ہمیں مستنصر حسین تارڑ کے دونوں ناول، یعنی " قلعہ جنگی" اور " خس و خاشاک زمانے " میں موجود مابعد نائن الیون کے حالات وواقعات کا جائزہ پیش کریں گے۔

بدلتے ہوئے عالمی حالات اور زبان کا تعلق:

"قلعہ جنگی" کی کہانی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ایک حصے میں فلیش بیک تکنیک استعمال کرتے ہوئے،سات جنگجوؤں کے آبائی حالات اور جہادی ڈسکورس کی شروعات دکھائی گئی جبکہ دوسرے حصے میں انہیں قلعہ جنگی میں قید دکھایا گیا ہے جہاں وہ دہشت گرد کہلاتے ہیں۔اب ان کے مد مقابل روسی فوجی نہیں،امریکہ بمبار طیارے تھے۔امریکہ نے اسامہ بن لادن کی تلاش میں ہر اس جگہ لاتعداد بم گرائے جہاں اسے بن لادن کی موجودگی کا تھوڑا سا بھی گمان تھا۔جنگ اتنی شدید تھی کہ لوگ روسی جارحیت بھی بھول گئے۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے جہادی ڈسکورس کو دہشت گردی کے ڈسکورس میں کیسے تبدیل کیا،اس کے لیے ہم مستنصر حسین تارڑ کے دونوں ناول " قلعہ جنگی" اور " خس وخاشاک زمانے "میں موجود مابعد نائن الیون کے حالات وواقعات کا جائزہ پیش کریں گے۔

سب سے پہلے امریکہ نے جہادی ڈسکورس کے ذریعے غیر ملکی جنگجوؤں کو افغان عوام پر مسلط کیا تھا۔مقامی افغان مجاہدین کے سے غیر ملکی جنگجو تعداد میں زیادہ تھے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا افغان جنگجو اور غیر ملکی جنگجوؤں کے درمیان کبھی اچھے تعلق نہ بن پائے۔جب قلعہ میں بند مجاہدین کے درمیان گھوڑا کھانے اور نہ کھانے ،یعنی اس کے حلال ہونے اور حرام ہونے کے متعلق بحث چلتی ہے تو اللہ بخش عبدالوہاب سے اس کے متعلق سوال کرتا ہے۔مستنصر حسین تارڑا " قلعہ جنگی" میں مقامی جہادیوں کے مقابلے میں غیر ملکی جنگجوؤں کی برتری کو اللہ بخش کی زبانی اس طرح بیان کیا:

> " تم بتاؤ عبدالوہاب خادم حرمین شریفین !تم سے بہتر حلال اور حرام کی
>
> تمیز کسے ہو سکتی ہے، ہم تو تمہارے پیروکار ہیں"(٦)

گویا عرب جنگجو مقامی جنگجوؤں پر اپنی فوقیت ثابت کرتے تھے۔ایک مسئلہ ہمارے کلچر کا بھی ہے، جس میں ہم عرب کی ہر چیز کو خود سے برتر سمجھتے ہیں۔اس فکر کو فروغ دینے میں خود عربوں سے زیادہ یہاں کے مقامی مذہبی وسیاسی رہنماؤں کا ہاتھ ہے۔اس نفسیاتی برتری کا اظہار ہمیں ناول قلعہ جنگی میں ایک اور جگہ بھی ملتا ہے،جب عبدالوہاب قلعہ

جنگی میں موجود باقی جنگجوؤں سے اپنا تعارف کرواتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں احساس برتری کا شکار ذہن نظر آتا ہے۔ عبدالوہاب اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"میں آل سعود سے ہوں۔۔۔ خادم حرمین شریفین سے ہوں"(۷)

افغانستان میں اتنی زیادہ تعداد میں غیر ملکی لوگوں کو اکٹھا کیا گیا کہ وہاں کی سماجی ڈیموگرافی ہی تبدیل ہو گئی۔ جس میں افغانستان کی سماجی ساخت کی بجائے عرب جہادی ڈسکورس کا عمل دخل زیادہ تھا۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے ان غیر ملکی جنگجوؤں کو، مختلف عرب اور افریقی ممالک کی جیلوں سے نکال کر انہیں سوویت روس کے خلاف جاری افغان جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ یہ تمام لوگ اپنے ملک اور معاشروں کے کوئی صحت مند شہری نہ تھے۔ ان لوگوں میں اکثریت ان پڑھ جاہل اور پیشہ ور مجرموں کی تھی۔ ان جنگجوؤں کو امریکہ نے سوویت افغان جنگ کے دوران خوب سپورٹ کیا۔ انہیں اسلحہ دیا، ڈالرز دیے اور سب سے بڑھ کر انہیں افغان معاشرے میں طاقت ور بنایا۔ آج افغانستان اور پاکستان انہیں بھگت رہے ہیں۔

" افغانستان کی جنگ لڑنے والے جتنے بھی ہیں وہ سب غیر افغان

ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ان میں عرب، قازق، پاکستانی، چینی شامل ہیں"(۸)

ان لوگوں کے مفاد، افغان جنگجوؤں سے کچھ مختلف تھے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ افغان طالبان کا مقصد افغانستان کو غیر ملکی فوجیوں سے آزاد کروانا تھا، جبکہ غیر ملکی جنگجوؤں کا مقصد پوری دنیا پر جہاد کے ذریعے اسلامی نظام کو رائج کرنا تھا۔ یہ غیر ملکی جنگجو ایسا اس لیے سوچتے تھے، کیونکہ انہیں افغان جہادی ڈسکورس کے ذریعے یہ بتایا گیا تھا کہ افغانستان میں افغانیوں اور روس کی جنگ نہیں، بلکہ کفر و اسلام کی جنگ ہے۔ یہ معرکہ حق و باطل ہے۔ پوری دنیا کے شدت پسند مسلمانوں کو یہ جھوٹ بول کر افغانستان میں روس کے مد مقابل لا کر کھڑا کیا۔ جبکہ یہ جنگ امریکہ اور روس کے درمیان جاری سرد جنگ کا آخری مرحلہ تھی۔ افغان جنگ میں شامل لوگ اس بات کا ابھی تک انکار کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے عقیدے کو ایک آفاقی سچ سمجھتے ہیں اور ہر اس فرد اور فعل کو جائز سمجھتے ہیں جو اس آفاقی سچ کو دنیا پر رائج کرنے میں معاون نظر آئے۔ امریکہ نے عرب اور دوسرے خطوں کے سادہ لوح مسلمانوں کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا

اور انہیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ پھر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان جنگجوؤں کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا گیا۔

مستنصر حسین تارڑ قلعہ جنگی میں اس حقیقت پر اس طرح رقمطراز ہیں:

" یہ دنیا کو ایک مثالی شکل میں دیکھنے کی تمنا۔۔۔ تمنا

کا دوسرا قدم انہیں یہاں تک لے آیا تھا"(۹)

جبکہ پاکستان میں " افغان باقی کوہسار باقی " جیسے کھوکھلے اور جذباتی نعرے ایجاد کیے گئے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں یہ پروپیگنڈہ امریکی جہادی ڈسکورس کے ذریعے پھیلایا گیا کہ افغانی دراصل پاکستان کی جنگ لڑ رہے۔

" یہیں سے اس سلوگن نے جنم لیا کہ افغانی دراصل پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں

اس لیے ان کی مدد کرنا ہمارا قومی اور ظاہر ہے مذہبی فریضہ ہے"(۱۰)

پاکستان میں اس ڈسکورس نے سب سے زیادہ افغانستان کی سرحد کے ساتھ موجود پشتون خطے کو متاثر کیا۔ یہاں کے رہنے والے پٹھانوں کی ثقافت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی۔ تاکہ انہیں افغان جنگ میں آسانی سے استعمال کیا جاسکے اور وہ دوسرے خطوں سے آنے والے جنگجوؤں کے لیے رکاوٹ نہ بنیں۔

پشتون ثقافت میں اتن کے رقص، رُباب کے سُروں اور رنگ برنگے گھاگھروں کی جگہ، بندوق، چرس، سمگلنگ، قتل اور تنگ نظری نے لے لی۔ گویا پشتون خطے کی ثقافت میں جان بوجھ کر ردوبدل کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج تین دہائیاں گزر جانے کے باوجود پشتون خطے سے شدت پسندی اور نفرت کو ختم نہیں کیا جاسکا۔ آج بندوق پٹھانوں کی ثقافت میں شامل ہے، جس کا سہرا پاکستان کی اشرافیہ اور امریکی جہادی ڈسکورس کے سر ہے۔ کیونکہ اس ڈسکورس کا تنقیدہ جائزہ کبھی نہیں لیا گیا جس کی وجہ سے ہم جہادی ڈسکورس کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے کوئی متبادل ڈسکورس

بھی نہ بنائے پائے۔ نتیجتاً ہمارا معاشرہ آج چالیس سال گزرنے کے بعد بھی اس ڈسکورس میں زندہ ہے۔ قلعہ جنگی میں گل شیر پٹھانوں اور بندوق کے تعلق پر سوال اٹھاتا ہے۔ وہ پشتون ثقافت کو اس بندوق سے لا تعلق کہتا ہے۔

"یار ہم پٹھان تو تھا مگر بندوق چلانا تو دور کا بات ہے، کبھی اس کو پکڑا ابھی نہیں

تھا۔ سب پٹھان بندوق نہیں چلا سکتا، صرف باہر کا لوگ یہ سمجھتا ہے"(۱۱)

بندوق قبائلیت کی نشانی ہے۔ پٹھان ثقافت کی نہیں۔ کیونکہ قبائلی دور میں لوگوں کی جان اور مال کی حفاظت کسی مرکزی حکومت یا طاقت کے سپرد نہ تھی، بلکہ ہر کوئی انفرادی سطح پر اپنی حفاظت کا خود ذمہ دار تھا۔ بندوق اپنی حفاظت کے لیے صرف پٹھانوں میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام قبائلی معاشروں میں موجود تھی۔ سب سے پہلے تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان کی اشرافیہ نے ہندوستان کے ساتھ ہونے والی جنگوں میں پٹھانوں کو آگے لانے کے لیے ان کے ساتھ بندوق اور لڑائی کو جوڑا، اس کے بعد سوویت افغان جنگ میں امریکہ اور اس کے سہولت کاروں نے پشتون ثقافت میں تبدیلی کر کے اس میں بندوق کو شامل کر دیا۔ ملک میں اس ڈسکورس کا اثر صرف عام لوگوں پر نہیں پڑا، بلکہ یہاں کے پڑھے لکھے طبقے نے بھی اس ڈسکورس کے زیر اثر، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں، اردو کی چوتھی کتاب کے سرورق پر پٹھان بچے کے ہاتھ میں بندوق تھما کر، اسے پشتون ثقافت کی علامت کے طور پر پیش کیا۔

پٹھانوں کے علاوہ دوسرے نمبر پر سب زیادہ پنجاب کا خطہ متاثر ہوا۔ پنجاب میں بریلوی مکتب فکر اکثریت میں ہے۔ باقی سنی فرقوں کی نسبت یہ لوگ لڑائی جھگڑوں اور قتل و غارت سے دور تھے۔ لیکن یہاں دیوبندی مکتب فکر اور وہابیت کو، اسی کی دہائی کے بعد فروغ دیا گیا۔ جس کے بعد یہاں کی بھی ثقافتی ڈیموگرافی پشتون خطے کی طرح تیزی سے تبدیل ہونے لگی۔ پنجاب کے طول و عرض میں سعودی اور امریکی فنڈنگ سے قائم ہونے والے مدارس کا جال بچھا دیا گیا۔ ان مدارس میں بھی کے پی کے میں مدارس کی طرح جہاد اور جنگ کے لیے ابھارنے والا نصاب رائج کیا گیا۔ پنجاب میں موجودہ شدت پسندی افغان جہادی ڈسکورس کی پیدا کردہ ہے۔ اس شدت پسندی کا یہاں کی تہذیب و ثقافت سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ افغان جہاد کے پس منظر کی وجہ سے ہمارے ہاں ثقافت اور عقیدے کا فرق ختم کر دیا گیا، اس لیے ہم آج تک اسی ڈسکورس میں جی رہے ہیں۔

یہ ڈسکورس آج بھی اتنا طاقتور ہے کہ اس کے خلاف بات کرنے والا گستاخ اور غدار کہلاتا ہے۔ اس ڈسکورس کی وجہ سے ہمارے ہاں مذہب اور ثقافت تفریق ختم ہو چکی ہے۔ عرب ثقافت اور اسلام میں واضح فرق ہے، جبکہ ہمارے ہاں عرب ثقافت اور عرب مفاد کو بھی اسلام کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ برصغیر کی مسلمانوں کا اسلام کے ساتھ ناانصافی ہے کہ وہ اسلام کی روح سے نابلد ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں اسلام کی وہ تعبیر رائج ہو جس کا زیادہ تر حصہ امریکی اور اس کے اتحادیوں کے افغان جنگ کو دوران ترتیب دیا۔ کسی بھی رائج ڈسکورس کے اثرات کو زائل کرنے کرنے، اس کے مقابلے میں ایک اور ڈسکورس پیدا کرنا پڑتا ہے، جو کہ ہم جیسی پسماندہ قوموں کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ اس لیے ہم جیسی پسماندہ قومیں ہمیشہ کسی نہ کسی طاقتور ملک کے زیرِ اثر رہتی ہیں۔ جہاں ان کے اپنے نظریات باطل کہلاتے ہیں اور ان کی ثقافت جہالت تصور کی جاتی ہے۔ پاکستان میں اس وجہ سے پاکستانی ثقافت کمتر سمجھی جاتی ہے اس کے مقابلے میں مغربی ثقافت کو برتر مانا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے مغربی ڈسکورس کا ہاتھ ہے۔ جس کا ہم آج تک کوئی متضاد ڈسکورس پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔

”خس و خاشاک زمانے“ اور مابعد نائن الیون دہشت گردی کا ڈسکورس

”خس و خاشاک زمانے“ مستنصر حسین تارڑ کا ایک اور شاہکار ناول ہے۔ جس کے آخری حصے میں نائن الیون اور اس کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال بیان کی گئی۔ تارڑ کے ہاں عصری شعور بے پناہ ملتا ہے۔ انہوں نے تاریخ کو نہ صرف اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے بلکہ ان واقعات سے پیدا ہونے والی سماجی تبدیلیوں اور انفرادی نفسیات کو بھی بیان کرتا ہے۔ اس ناول میں انعام اللہ کے ذریعے ایک پاکستانی کی کہانی بیان کی، جو نائن الیون کے بعد مسلمانوں کے خلاف پیدا ہونے والے امریکی رد عمل پر افسردہ ہوتا ہے۔ انعام اللہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے جو امریکہ میں ایک عرصے سے رہائش پذیر ہے۔ انعام اللہ باقی امریکیوں کی طرح مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں رکھتا، پھر بھی اسے اپنے اسلامی نام کی وجہ سے کئی دفعہ امریکی نفرت کا نشانہ بناتے ہیں۔

امریکہ نے نائن الیون کے بعد اپنے معاشرے میں اور پوری مغربی دنیا میں اسلام کے خلاف یہ نفرت کیسے پھیلائی، مسلمانوں کے دہشت گردی سے کیسے جوڑ کر پیش کیا، یہ تمام تبدیلیاں دہشت گردی کے ڈسکورس کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ مغرب میں اسلاموفوبیا اور مسلمانوں سے نفرت جیسے جذبات دن بدن اسی ڈسکورس کی وجہ سے شدید ہوتے جا رہے ہیں۔ دہشت گردی کے اس ڈسکورس نے نہ صرف مغرب میں عوامی رائے کو مسلمانوں کے حوالے متشدد بنایا بلکہ پاکستان، افغانستان اور باقی عرب ممالک میں اسلامی شناخت سے بیاری نے جنم لیا۔ جس کو یہاں کبھی لبرل ازم کہا جاتا ہے کبھی روشنی خیالی بنا کر پیش کیا جاتا ہے کبھی فیمینزم تو کبھی سوشلزم کا لبادہ پہنایا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی سوسائٹی میں یہ تمام رویے کسی رد عمل کی پیداوار ہیں اور رد عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے رویے اور رجحان منطقی سے زیادہ جذباتی ہوتے ہیں۔

دہشت گردی کے ڈسکورس کا پاکستانی اور افغانی سماج پر اثرات:

جس طرح ہم نے مستنصر حسین تارڑ کے ناول " قلعہ جنگی" کے توسط سے دیکھا ہے، عالمی طاقتوں کے مفاد سے پیدا ہونے والا جہادی افغان اور پاکستانی سماج کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ مذکورہ سماج کی مجموعی ڈیموگرافی تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان کی تاریخ، نظریات، ثقافت، مقاصد، نظریات، رویے اور رجحان سب کچھ جہادی ڈسکورس کی نظر ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک ایسا معاشرہ جنم لیتا ہے جو بیرونی غاصب قوتوں کی انگلیوں پر ناچتا ہے۔ ان کے نزدیک نہ کوئی اجتماعی مقصد ہوتا، نہ کوئی سماجی و اخلاقی اقدار باقی رہتی ہیں نہ ہی کوئی اپنی ثقافت۔ یہ قومیں پرائی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر لڑتی ہیں، پرائی ثقافت کا اپنی ثقافت مانتی ہیں، پرائے نظریات پر اپنے لوگوں کی جان تک لے لیتی ہیں۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے اپنے مفاد کی خاطر، جہادی ڈسکورس کو جب دہشت گردی کے ڈسکورس میں تبدیل کیا تو یہ تبدیلی نہ صرف افغانستان اور پاکستان کے لیے خطرناک ثابت ہوئی بلکہ عالمی سطح پر جہاں بھی مسلمان سکونت پذیر تھے ان کے لیے بھی اس کے اثرات انتہائی برے اور تکلیف دہ تھے۔ ان مسلمانوں کو کہیں دہشت گرد کہہ کر پکارا جاتا کہیں ملا، کہیں جاہل، کہیں انسانیت کے دشمن، کہیں شدت پسند، کہیں مغرب کے دشمن، کہیں قبائلی اور کہیں جہادی یا فسادی۔۔۔۔۔ یہ وہ تمام الفاظ تھے جو نائن الیون کے بعد، دہشت گردی کے ڈسکورس کے ساتھ مغرب کی زبان پر عام تھے۔ گو کہ یہ رویے بنانے والے بھی مغرب کے اپنے ہی ادارے اور لوگ تھے مگر عام یورپی عوام کو اس کا ادراک نہیں تھا۔

اسلاموفوبیا اور مغرب:

افغان اور سوویت جنگ کے دوران، جس طرح مغربی ممالک کی ٹیلی وژن دن رات افغانستان میں روسی مظالم دکھا کر اپنے لوگوں کو اس بات پر قائل کیا کہ اس جنگ میں شامل ہونا مغربی ممالک اور امریکہ کی اخلاقی ذمہ داری ہے، بالکل اسی طرح نائن الیون کے بعد، طالبان اور القاعدہ کی بھیانک تصویر بار بار امریکی لوگوں کے سامنے پیش کی گئی، اس کا ذریعہ بھی امریکی میڈیا تھا۔ نائن الیون کے حادثے پر ہالی ووڈ میں بے پناہ فلمیں بنائی گئیں، کتابیں لکھی

گئیں،اور نائن الیون کے واقعے کی فوٹیج ،بار بار ٹیلی وژن پر چلائی گئی۔ جس کی وجہ سے ہر امریکی شہری خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگا۔ ان ممالک میں رہنے والا ہر مسلمان ان گوروں کو دہشت گرد نظر آنے لگتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اس بات کو اپنے ناول میں اس طرح بیان کیا ہے۔

" ٹیلی وژن پر اس امریکی کربلا کا ایک ایک لمحہ ہزاروں بار دہرایا جارہا تھا
اور یہ باوور کرایا جارہا۔۔۔ یہ مناظر اتنی تواتر سے سکرین پر دکھائے گئے کہ
ہر امریکی کے بدن پر تصویروں کی صورت ثبت ہو گئے ،ان کے ذہنوں پر
ایک ٹیٹو کی مانند گندھے گئے "(۱۲)

اس میڈیائی پروپیگنڈہ کا اثر صرف امریکی شہری آبادی پر نہ تھا،بلکہ امریکہ کے دیہات بھی اس پھیلائی گئی نفرت میں زہر اگلنے لگے۔ کیونکہ لوگوں کے ذہن میں نقب لگانے کے لیے زبان سے طاقت ور ہتھیار کوئی نہیں۔ امریکی میڈیا نے نائن الیون کے بعد ،دہشت گردی ،طالبان ،القاعدہ ،جہاد ،اسلامی جہاد جیسے الفاظ کو لامحدود مرتبہ دہرا کر ،اپنے ملک کے علاوہ یورپی دنیا کو بھی اس بات پر قائل کر لیا کہ ،مسلمان دہشت گرد ہیں ،القاعد اور طالبان دنیا کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف دہشت گردی ،طالبان ،القاعدہ ،جنگ اسلام ،جہاد ،ملا جیسے الفاظ نئے ڈسکورس کو بنیادیں مہیا کرنے لگے۔ اس کا اثر اتنا شدید اور اتنا تیز تھا کہ ،یورپ اور امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں نے اپنی عبادت گاہوں میں جانا چھوڑ دیا ،گوروں نے مسلمانوں کے ریسٹورنٹس کا بائکاٹ کر دیا ،ہر اس کی سروس کو چھوڑ دیا جس کو کوئی مسلمان مہیا کر رہا تھا۔

"شیرف ہر مسلمان کے دروازے پر دستک دیتا تھا اور کہتا تھا۔۔۔ جناب میرے
ڈیپارٹمنٹ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد آپ لوگ اپنی عبادت گاہ
مسجد میں جانے سے جھجکتے ہیں۔ وہاں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا
ہوں کہ آپ بالکل محفوظ رہیں گے "(۱۳)

اس کے بعد امریکی لوگوں نے ہر اس چیز سے نفرت کرنا شروع کر دی جس کا تعلق کسی بھی طرح اسلام یا مسلمان سے ہوتا۔ انعام اللہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوتا ہے۔ نائن الیون کے بعد امریکی میڈیا اور ادب کے ذریعے ایسی ڈر اور خوف کی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ انعام اللہ کئی دن کام کے لیے اپنے گھر سے نہ نکل سکا۔ جب گھر میں فاقوں کا خدشہ بڑھتا ہے تو وہ اللہ اللہ کر کے اپنی ٹیکسی نکالتا ہے اور کام کے لیے نکل جاتا ہے۔ جہاں اسے کچھ سواریاں ملتی ہیں وہ انہیں اپنی منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ ان سواریوں نے انعام اللہ سے نہ اس کا نام پوچھا نہ ہی اس کے عقیدے بارے کوئی بات کی۔ انعام اللہ کا اندر کا ڈر کچھ کم ہوا ہی تھا کہ اس نے ایک اور سواری اٹھائی۔ یہ امریکی دہشت گردی کے ڈسکورس کا ڈسا ہوا تھا۔ اسے نے بیٹھتے ہی انعام اللہ اسے نام پوچھا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ انعام اللہ ایک مسلم ہے، وہ انعام اللہ کو نفرت کا نشانہ بناتا ہے کہ تم لوگ دہشت گرد ہو، یہاں سے نکل جاؤ۔

"میں کہیں نہیں جا رہا یو ٹیررسٹ۔۔۔ لیکن میں یہ بتا سکتا ہوں

تم کہاں جا رہے ہو۔۔۔ جہنم میں۔۔۔ یو کین گو ٹو ہیل" (۱۴)

یہ ایک عام امریکی رویہ تھا جس کا امریکہ میں رہتے ہوئے انعام اللہ جیسے ہزاروں مسلمان روزانہ سامنا کرتے تھے۔ انعام اللہ جیسے ہزاروں مسلمان جو القاعدہ اور طالبان کے نام سے بھی ناواقف تھے، انہیں جہاد کیا اسلام کا بھی کچھ پتہ نہیں تھا، یہ لوگ بس نام کے مسلمان تھے۔ ان لوگوں نے کبھی مسجد میں گئے ایک زمانہ ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کے پاس ان کے نام کے سوا کچھ بھی اسلامی نہیں تھا۔ بلکہ ان میں سے اکثر تو افغانستان میں ہونے جہاد سے اس قدر ناواقف تھے کہ انہیں ملا عمر، بن لادن الظواہری جیسے لوگوں کا نام تک پتہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود کیونکہ ان لوگوں کا نام اسلامی تھا اور یہ لوگ شکل و صورت کے حساب سے عرب یا پاکستانی اور افغانی تھے اس لیے انہیں امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں مذہبیٔ نفرت کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود امریکی شہریوں کے ذہن میں ایسی نفرت انڈیلی گئی کہ وہ ہر مسلمان کو دہشت گرد جانتے۔ اس دن جب انعام اللہ گھر سے نکلا تو ٹیکسی میں بیٹھنے والی سواری نے اسے دہشت گرد کہہ کر گالیاں دیں۔

مغرب میں یہ رویہ بھی ان کی اپنی فکر و سوچ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ رد عمل تھا کا نتیجہ تھا اور نائن الیون کے بعد کے ڈسکورس کا حاصل تھا۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول اس طرح لکھا :

"یہ مسافر (اسلاموفوبیا کا شکار) خصوصی طور پر جارج بُش اور امریکی
میڈیا نے مینوفیکچر کیا تھا، یہ پروپیگنڈہ مشینری کی فخریہ پیش کش تھی،
جس نے بیشتر امریکیوں کو روبوٹس میں بدل دیا تھا"(۱۵)

اسلاموفوبیا کی ایسی فضا قائم ہوتی ہے کہ پورا یورپ اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو مساجد جانے سے روک دیا جاتا ہے۔ انہیں بازار میں، ٹرین میں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں غرض ہر جگہ اسلاموفوبیا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ روس کے خلاف جنگ کے دوران جس طرح مسلسل دنیا کی برین واشنگ کی گئی، بالکل اسی طرح نائن الیون کے بعد دنیا کی اسلاموفوبیا سے مسلسل برین واشنگ کی جاتی ہے۔ مسلمان جو یورپی اور امریکی ممالک کی ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کر رہے تھے، جو ان ممالک کے پارلیمنٹ اور دوسرے ریاستی اداورں میں اعلیٰ عہدوں پر خدمات سرانجام دے رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے اچھوت بنا دیے جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق روا نہ رکھا گیا۔ انہیں سماجی سطح پر دیوار سے لگانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

مصنف کے بقول امریکہ میں اچانک اچھوت کا نظام رائج ہو جاتا ہے جس میں مسلمان اچھوت کہلائے جاتے ہیں۔ یہ وہ مغرب ہے جو ایک وقت ہندوستان اور پاکستان میں ذات پات اور رنگ و نسل کی تفریق پر نالاں نظر آتا ہے۔ آج ان کے اپنے ہاں یہی نظام پروان چڑھ رہا ہے۔ نائن الیون کے مغرب نے مسلم شناخت کی حامل ہر چیز کو خود سے الگ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وہاں رہنے والے مسلمانوں میں اجنبیت اور بے چینی میں اضافہ ہوتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول میں مغرب کے اس رویے پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ کیسا مغرب ہے جہاں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جس کی یہ مغرب کبھی نفی کرتا تھا۔ ان کے بقول:

"امریکہ میں یکدم اچھوت کا نظام رائج ہو گیا تھا، اچھوتوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔۔ بلکہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی موزلم آباد تھے وہ سب کے سب شودھر ہو گئے تھے۔۔۔ اَن ٹچ ایبل"(۱۶)

عالمی سطح پر نمودار ہونے والے اس دہشت گردی کے ڈسکورس کا اثر اتنا شدید تھا کہ پورا مغرب اس کے زیر اثر چلا گیا۔ شہری آبادی کے ساتھ ساتھ دیہاتی لوگ بھی اسلاموفوبیا کا شکار ہونے لگے۔ جہاد اوور دہشت گردی کو اس طرح گڈ مڈ کر کے پیش کیا گیا کہ مغرب اسلام اور دہشت گردی میں فرق ہی نہ کر پایا۔ اسی کی دہائی جب افغان جنگ شروع ہوئی تھی تو ہمارے ہاں بھی جنگ اور اسلام کو یوں ایک دوسرے میں ضم کر کے دکھایا گیا کہ پاکستان اور افغانستان کے لوگ جنگ اور عقیدے میں فرق کرنے کی اہلیت ہی کھو بیٹھے۔ امریکہ عین اسی طرح مغرب میں اسلام اور دہشت گردی کو یوں ملا کر پیش کیا کہ مغرب میں اس کی تمیز ہی ختم ہو گئی۔ القاعدہ کو اسلام کی نمائندہ تصویر بنا کر پیش کیا گیا۔ جبکہ اسلام صرف القاعدہ کے پاس نہیں تھا۔ امریکی و مغربی دانشور تک اس بات میں فرق کرنے سے قاصر رہے۔ بقول مستنصر حسین تارڑ نائن الیون کے بعد امیر کی روبوٹ پیدا ہوئے جو صرف اسلاموفوبیا کا شکار تھے۔ ان کے نزدیک مسلمان کا لفظ دہشت گرد کے مترادف تھا اور اسلام جہالت کے ہم معنی تھا۔

"گیارہ ستمبر کے بعد امریکہ کیں جن روبوٹس نے جنم لیا وہ بھی انہیں روبوٹس کے بھائی بند تھے جو پاکستانی مدرسوں میں مینوفیکچر کیے جا رہے تھے"(۱۷)

امریکہ کے تمام ٹیلی وژن گیارہ ستمبر کے بعد، افغانستان میں امریکی حملوں کے نتیجے میں افغانیوں کے راکھ کا ڈھیر بنتے گاؤں، معصوم اور بے گناہ لوگوں کی جلتی ہوئی لاشیں، لائیو دکھاتے۔ امریکی ایئر فورس اور اس کی آرمی کی کاروائیوں کو اس طرح پیش کیا جاتا جیسے کوئی جنگ پر مبنی ویڈیو گیم ہو۔ ہر زبان پر امریکی فوج کی بات تھی۔ اس وقت ہر امریکی شدت

پسندی کے اس مقام پر کھڑا تھا، جہاں کبھی پاکستانی اور افغانی براجمان تھے۔لائیو شو کے درمیان افغان لوگوں کا مذاق اڑایا جاتا۔ انہیں انسان نہیں جانوروں کی طرح پیش کیا جاتا۔ جیسے وہ کیڑے مکوڑے ہوں۔

"تم کیا سمجھتے ہو وہ داڑھی والا پاگل شخص اس وقت اپنی مٹی کے
سوراخ۔۔۔ کسی غار میں ہکابکا بیٹھا کیا کر رہا ہو گا۔۔۔ گوبر کی آگ
پر برگر بنا رہا ہو گا۔۔۔۔ ہم اسے گوبر برگر کا نام دے سکتے ہیں"(۱۸)

جبکہ ایک اور جگہ پر مستنصر حسین تارڑ نے اس رویت کی یوں تصویر کشی کرتا ہے جب سیرت اپنے کمرے میں آکر ٹیلی وژن آن کرتی ہے تو اسے دھویں کے بادل، چیخ وپکار، گولیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔یہ امریکی فوج کی افغانستان میں لائیو کاروائی کے مناظر تھے۔ سیرت درجن بھر چینلز بدلتی ہے، لیکن منظر نہں بدلتا۔سب جگہ یہی جنگ دکھائی جارہی ہوتی ہے۔

"درجن بھر چینلز بدلنے پر بھی منظر نہ بدلا۔۔ ہیلی کاپٹروں کی کھٹ کھٹ۔۔ گو
گو۔۔میزائیلوں کا دھواں اور آتشی غبار۔۔۔ ایئر کرافٹ کیریئر جو بحر ہند میں
تیرتے تھے ان میں سے اٹھنے والے طیارے۔۔۔ اور چہرے۔۔ دہشت اور
موت سے نقش چہرے۔۔۔اس نے جھلا کی ٹی وی آف کر دیا"(۱۹)

یہ وہ رویہ تھا جو امریکہ جیسے نام نہاد ترقی پسند اور لبرل ملک میں دن بدن شدت اختیار کر رہا تھا۔ اس رویے کو بنیاد بنا کر امریکی اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔اب وہ خود اسی رویے کی پرورش کر رہے تھے، جسے امریکہ اور یورپ کے علاوہ عرب اور دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی طاقتور میڈیا کے ذریعے پھیلایا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں الحاد کی تحریک کو ہوا دی گئی۔

افغان مہاجرین کی پاکستان آمد:

سوویت افغان جنگ کے دوران بھی بے شمار افغانی اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان آ گئے تھے۔ جہاں انہیں پاکستانی معاشرے نے اسلامی بھائی چارے کے جذبے کے تحت خوش آمدید کہا۔ اس وقت پاکستان حکومت اور افغانستان کے جہادی ایک پیج پر تھے۔ دونوں امریکی چھتری کے نیچے روس کے خلاف بر سرپیکار تھے۔ جس کی وجہ سے ہمیں اسی کی دہائی میں سرحد کے آر پار اور وسطی پاکستان یہاں تک کہ پنجاب اور سندھ تک کسی قسم کا کوئی انتشار نظر نہیں آتا۔ جبکہ نائن الیون کے بعد ان لاکھوں افغان مہاجرین اور پاکستانی حکومت کے درمیان کوئی مشترک یا ایک مقصد نظر نہیں آتا، بلکہ نائن الیون کے بعد پاکستان حکومت ،افغانستان میں لڑنے والے جہادیوں کے خلاف امریکہ کا ساتھ دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ملک میں ایسی دہشت گردی کی لہر چلی، جسے آج تک مکمل ختم نہ کیا جا سکا۔ تباہ حال ہزاروں افغانی اپنا سب کچھ افغانستان میں چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کی تباہ حالی کا نقشہ ناول میں یوں پیش کیا گیا ہے:

"سکرین پر پاکستان کے سرحدی شہر چمن میں ہزاروں اجڑے ہوئے لوگ افغانستان سے فرار ہو کر پاکستان داخل ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ یک عمر رسیدہ افغان ٹیلی ویژن کو سامنے پا کر ٹھٹک جاتا ہے اس کی گود میں ایک پوٹلی ہے وہ اس پوٹلی کو اس لیے کھول کر دکھاتا ہے تاکہ سرحدی اہلکاروں کو یقین ہو جائے کہ اس میں ہتھیار نہیں ہیں، پوٹلی میں ایک بچے کا بارود سے بھنا ہوا سیاہ دھڑ اور حیران آنکھوں والا مسخ شدہ سر ہے "(۲۰)

نائن الیون کے وقت افغان مہاجرین کو پاکستان میں رہتے ہوئے کم و بیش بیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا، اب وہ یہاں کے سماج کا حصہ تھے، اور یہاں کے لوگوں میں افغان مہاجرین کے لیے ہمدردی بھی پیدا ہو گئی تھی اور اسلامی بھائی چارے اور جہاد کی ڈسکورس کی وجہ سے یہاں کی عوام افغان مہاجرین اور جہادیوں کو حق بجانب مانتے تھے۔ اس لیے جب پاکستانی حکومت نے امریکہ کے کہنے پر طالبان کے خلاف ایکشن لیا تو ردعمل اتنا شدید تھا کہ ہماری سیاسی اور عسکری لیڈر شپ نے بھی سر پکڑ لیے۔ ماضی کی طرح امریکہ نے دو آپشن دیے کہ یا تو ہمارا ساتھ دیں یا پھر آپ ہمارے دشمن تصور

کیے جائیں گے۔ یہ وہ دھمکی ہے جس کا امریکہ پہلے بھی کئی دفعہ استعمال کیا اور ہم اس کی دھمکی کے آگے ڈھیر ہو گئے۔ اس حوالے سے ہمارے دو طرح کے رویے پائے جاتے۔ ایک طبقیہ کہتا ہے ہمیں امریکہ کی کوئی بھی بات نہیں ماننی چا ہیے بلکہ اس سے ہر قسم کے تعلق کو ختم کر دینا چاہیے۔ میرے خیال میں یہ ایک شدت پسند رویہ ہے۔ کیونکہ ہم ترقی یافتہ دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتے اور ایسے میں جب ہمارے ملک اکثر اخراجات ان ممالک کی وجہ سے پورے ہو رہے ہوں۔ اس کے علاوہ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کا یہ کہنا ہے کہ ہمیں امریکہ اور مغرب کی اس حد تک فرمانبرداری کرنی چاہیے کہ ہم جیسے ان کی کالونی ہوں۔ یہ طبقی بھی دوسری انتہا پر کھڑا ہے۔ میرے خیال میں اس دور میں تمام مما لکا یک دوسرے پر کہیں تھوڑا اور کہیں زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ ہمیں بھی ایسے ہی مفاہمت کی پالیسی اپنا کر، ان جیسے بڑے ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کرنے چاہیں۔ یاد رہے مفاہمت اس حد تک ہو کہ قومی خودمختیاری قائم رہے اور عوام کے مفاد بھی مقدم ہوں۔ بہر حال مستنصر حسین تارڑ اس جنگ پاکستان کی شمولیت پر اس طرح رقمطراز ہے:

"نصف شب کی قربت میں جب ایک کمانڈو جنرل جس کی جرآت و شجاعت کا کچھ

حساب نہ تھا ہڑ بڑا کر اپنے بستر سے اٹھتا ہے تو اٹینشن ہو جاتا ہے۔ یس سر۔۔۔ یا تو

آپ ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں ہیں۔۔ اگر نہیں تو۔۔۔ ووئی وِل بومب یو ٹو سٹون

ایج۔۔۔۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں سر" (۲۱)

پھر اس کے بعد کیا ہوا، لاکھوں افغان جہادی جنہیں سالوں کی محنت سے، ملک و قوم کا سرمایہ، شناخت، ثقافت، نظریات سب کچھ داؤ پر لگا کر تیار کیا تھا وہ آن کی آن اپنے دشمن بنا دیئے گئے۔ امریکہ کو ان جہادیوں کے نام کی طویل فہرستیں تھما دی گئیں، کچھ خود پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا گیا، بہت ساروں کے ٹھکانوں کے بارے معلومات، انٹیلی جنس شیئرنگ کے نام پر امریکہ کو تھمائی گئیں اور رہی سہی کثر امریکہ کو پاکستان میں فوجی اڈے فراہم کر کے پوری کی گئی۔

ادھر افغانیوں کے ذہن میں زہر گھول دیا گیا تھا کہ پاکستان نے افغانستان پر حملے کے لیے امریکہ کو اپنے اڈے دیے ہیں۔ اب امریکی جہاز پاکستان کی زمین سے اڑ کر افغانستان پر بمباری کریں گے۔ فضائی حملوں میں چونکہ بے گناہ لوگوں کی موت کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے ان حملوں میں بھی زیادہ تر بے گناہ افغانی مارے گئے۔ جس کی وجہ سے

افغان جہادیوں کے ساتھ ساتھ افغان عوم کے دل میں بھی پاکستان کے لیے نفرت پیدا ہو گئی۔ اس نفرت کو طالبانوں کے علاوہ دوسرے ممالک کی ایجنسیوں بھی اپنے مفاد کے حصول کے لیے پاکستان کے خلاف استعمال کی۔

ان ڈرون طیاروں اور دوسرے بی۔ ۵۲ بمبار طیاروں سے جہاں بھی کہیں کوئی موت واقع ہوتی پاکستان کے خلاف افغانوں کی نفرت جوں جوں بڑھتی جاتی۔ یہ بمبار طیارے پاکستان میں پشاور اور بلوچستان کے شہر جیکب آباد کے ہوائی اڈوں سے اڑان بھرتے تھے۔ ان طیاروں کے ذریعے کلسٹر بم افغانستان پر پھینکے جاتے، جو کہ انتہائی انسانیت سوز بموں کی فہرست میں آتے ہیں۔

"انعام اللہ کے سر کے اوپر سے بھی گونجتے یہ طیارے پرواز کرتے چلے جارہے
تھے۔۔ یہ بمبار اس لیے اسے اپنے سر کے اوپر سے گزرتے ہوئے محسوس ہو رہے
تھے کہ وہ پشاور اور جیکب آباد کے امریکی ہوائی اڈوں سے ٹیک آف کر رہے تھے"(۲۲)

دہشت گردی اور مسلم شناخت:

نائن الیون کے بعد بہت ساری ایسی چیزیں جو مسلمانوں میں ایک عام بات تھی۔ اسے مسلم شناخت کی بجائے اسلامی دہشت گردی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا۔ جیسے اسی کی دہائی کے جہادی ڈسکورس میں بندوق کو پشتون ثقافت کی نمائندہ علامت کے طور پر پیش کیا گیا۔ بالکل اسی طرح عالمی سطح پر داڑھی اور پگڑی کو دہشت گردی کی علامت بنایا گیا۔ گویا مغربی ملکوں میں لمبے قمیض، اونچی شلوار، داڑھی پگڑی حتیٰ کہ مسلمانوں کے نام تک، دہشت گرد سمجھے جانے لگے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مغربی مفادا کی خاطع مسلمانوں کو جہاد اور دہشت گردی پر اکسایا گیا، لیکن اس مخصوص گروہ کو اسلام کا نمائندہ گروہ بنا کر پیش کرنا، مغرب کی کم علمی تھی یا اس کی سب سے بڑی منافقت۔

انعام اللہ بھی ان اس نفرت کا بار بار شکار ہوتا رہا۔ مسلمانوں کے ساتھ اس نفرت آمیز رویے کا ایئرپورٹس سے لے کر گلی کوچوں، ریستورانوں، یونیورسٹی کالجوں اور کاروباری جگہوں پر بھی اظہار کیا گیا۔ اس کی سب سے زیادہ ذلت

آمیز شکل ہمیں ایئرپورٹس پر دیکھنے کو ملتی۔ جہاں کسی بھی شخص کو محض اسلامی نام کی وجہ سے روک لیا جاتا اور اس کی الگ سے تفتیش ہوتی۔

ویسے تو نائن الیون کے بعد مغرب ممالک نے پاکستان، افغانستان، عراق، شام اور لبنان کے شہریوں کے لیے ویزے بند کر دیے تھے۔ باقی جن مملاک نے مندرجہ بالا ممالک کے لیے محدود ویزے جاری رکھے انہوں نے اپنے ملک میں داخلے کے قوانین سخت اور ذلت آمیز بنا دیے تھے۔ ان ممالک میں ایئرپورٹس پر مسلمانوں سے امتیازی سلوک برتا جاتا، جن میں ان کی غیر ضروری تلاشی اور پوچھ گچھ کے دوران دہشت گردی اور اسلاموفوبیا کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ ذلت آمیز رویہ اس ڈسکورس کی پیداوار تھا جس کو مغرب نے افغانستان اور دوسرے اسلامی ممالک پر حملہ کرنے کے جواز کے طور پر بنایا تھا۔ اس ذلت کا نقشہ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول میں یوں کھینچا:

"یہ سرچ لائٹ جنوبی امریکیوں۔۔۔ سری لنکن۔۔۔ ہندوستانیوں

اور نیپالیوں وغیرہ کے سروں پر سے تو گزر جاتی تھی لیکن موزلمز کے

سروں پر ٹھہر جاتی تھی"(۲۳)

یہ امتیازی سلوک صرف ایئرپورٹس تک محدود نہیں تھا بلکہ شاپنگ مالز کے گیٹ پر بھی مسلمانوں، خصوصاً داڑھی اور سلوار قمیض پہنے ہوئے ہر شخص کو روکا جاتا اور اس سے غیر ضروری پوچھ گچھ کی جاتی۔ مغرب میں یہ رویہ اس ڈر اور خوف کی پیداوار تھا جس کو روز مغربی میڈیا اپنے چینلز پر لائیو دکھا رہا تھا، یا مغربی اخبار کی وہ سُرخیاں جس میں دہشت گردوں کو اسلامی شناخت دے کر پیش کیا جا رہا تھا۔ ٹیلی وژن، اخبار، میگزین، سوشل میڈیا، عوامی مقامات وغیرہ، غرض ہر جگہ گلے کاٹتے، گولیاں چلاتے، اللہ اکبر کے نعرے لگاتے جنگجوؤں کو اسلامی دہشت گرد بتا کر دکھایا جا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے سے وقت میں پورا مغرب اسلاموفوبیا کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس کا اظہار کبھی کم تو کبھی شدید صورت میں سامنے آتا ہے۔ ابھی تک آ رہا ہے۔

پاکستان اور دہشت گردی:

پاکستان اور پاکستانی عوام کو بھی سوویت افغان جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔اس جنگ کا تاوان پاکستان میں رہنے والے لوگوں نے تریاسی ہزار بے گناہ لاشیں اٹھا کر ادا کیا، جو اب بھی جاری ہے۔

اس حوالے سے چودہ نومبر دو ہزار بیس کو پاکستان کے وزیر خارجہ نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا کہ، اب تک دہشت گردی کی وجہ سے تریاسی ہزار بے گناہ پاکستانی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔

" دو ہزار ایک سے لے کر اب تک پاکستان نے ۱۹۱۳۰ دہشت گرد حملے ہوئے

جس کے نتیجے میں ۸۳ ہزار سے زیادہ قیمتی جانوں کا نقصان ہوا ہے۔"(۲۴)

جبکہ بیرون ملک کام کرنے والے پاکستایوں نے دہشت گرد کہلوا کر ذلت برداشت کی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف یہ نفرت دن بدن بڑھتی جارہی تھی، لیکن پاکستانیوں کے خلاف یہ نفرت کچھ زیادہ تھی۔ کیونکہ افغان جنگ میں سب سے زیادہ افرادی قوت ہماری استعمال ہوئی، دوسرے الفاظ میں اس جنگ میں سب سے زیادہ پاکستانی لوگ بطور ایندھن استعمال ہوئے تھے۔ اس لیے مغرب کے نزدیک سب سے بڑے دہشت گرد ہم تھے۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی دہشت گردی کا واقعہ رونما ہوتا تو اس کے ڈانڈے پاکستانی زمین سے ملتے۔ مغرب میں ہماری پہچان بطور دہشت گردی کے ایکسپورٹرز کی تھی۔ اس بدنامی اور ذلت سے تنگ آکر کر مغربی ممالک میں مقیم بعض پاکستانی ،کسی کے پوچھنے پر اپنی شناخت سے ہی مکر جاتے تھے۔ وہ خود کو پاکستانی بتانے کی بجائے ہندوستانی یا افغانی بتاتے، تاکہ ذلت آمیز پوچھ گچھ سے محفوظ رہیں۔

خس و خاشاک زمانے میں مستنصر حسین تارڑ ایک پاکستانی ہزارہ خان کے نام سے متعارف کرواتا ہے۔ جو روز روز کی اس پوچھ گچھ سے تنگ آکر پاکستانی ہونے سے مکر جاتا ہے اور خود کو تاجک اور ازبک بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ احمد شاہ محسود کے ساتھ اپنا تعلق بتاتا ہے۔ وہ جب بھی کسی مجمعے میں شریک ہوتا ہے اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے احمد شاہ مسعود کے ساتھ منصوب جھوٹے قصے سناتا ہے۔ احمد شاہ مسعود کیونکہ طالبان کے خلاف تھا اس لیے امریکیوں کے قابل

برداشت آدمی تھا۔ اس وقت مجموعی امریکی اور مغربی سوچ یہی تھی کہ جو بندہ طالبان کے خلاف نہیں وہ ہمارے ساتھ نہیں بلکہ وہ ہمارا دشمن ہے۔

"ہزارہ خان سیانا تھا۔۔۔ وہ ان کی مانند اپنی پہچان کا پرچم بر سر عام نہ لہراتا وہ
اپنے پاکستانی ہونے سے دستبردار ہو کر اپنا تعارف افغان ازبک کے طور پر
کرواتا تھا۔ احمد شاہ مسعود کے ساتھ اپنی گہری رفاقت کے قصے دہراتا تھا"(۲۵)

پاکستان جو ایک وقت میں امریکہ اور مغربی ممالک کا محبوب ترین فرنٹ لائن اتحادی تھا وہ اب مغربی دنیا میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ اور روس کی سرد جنگ میں پاکستان نے فیصلہ کن اتحادی کا کردار ادا کیا تھا۔ اس جنگ میں پاکستان کی معیشت، اس کا سماج، اس کے لوگ اور اس کے نظریات، سب کچھ داؤ پر داؤ پر لگا تھا۔ بدلے میں کیا ملا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ پاکستان کو گرے بلیک لسٹ کیا گیا، ایکسپورٹ کو محدود کر دیا گیا، طرح طرح کی پابندیاں لگائی گئیں۔ یہ سب کچھ نائن الیون کے بعد دو سال کے عرصے میں ہوا۔

اسلام اور دہشت گردی:

کسی بھی نظریے اور اس پر عمل کرنے والوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ہم کسی بھی نظریے اس پر عمل کرنے والوں کے عمل کو سامنے رکھتے ہوئے جانچیں گے تو یہ کسی بھی نظریے کو جانچنے کا غلط پیمانہ ہو گا۔ جیسے مارکسزم حقیقت میں کچھ اور ہے جبکہ اس پر عمل کرنے والوں میں کچھ طرح کا نظر آتا ہے۔ بالکل اسلام حقیقت میں کچھ اور ہے جبکہ اس کو ماننے والوں کے ہاں کچھ اور نظر آتا ہے۔ پیروکاروں کو نظریے کے پیمانے پر جانچا جائے نہ کہ نظریے کو اس کے پیروکاروں کی کسوٹی پر۔

یہی وجہ ہے کہ امریکہ پر حملہ کرنے والے لوگ مسلمان ضرور تھے لیکن اسلام کے نمائندہ لوگ ہر گز نہ تھے۔ کیونکہ ان لوگوں کی ان کاموں سے بھری پڑی تھی جنہیں اسلام میں واضح طور پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ لوگ شراب پیتے، زنا کرتے، جھوٹ بولتے، دوسروں کا حق مارتے، سب سے بڑھ کر یہ دوسروں انسانوں کے لیے امن و

سلامتی کی بجائے کے لیے مشکلات پیدا کرنے والے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کو اسلام کے ساتھ نتھی کرنا غیر حقیق بات ہے۔

لیکن مغرب نے نفرت کی آگ لگا کر مضبوط میڈیائی پروپیگنڈہ کی بنیاد پر جدید دنیا کو اس بات پر قائل کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ افغانستان پر حملے کے وقت آدھی دنیا نے امریکی ہاں میں ہاں ملائی۔ پوری دنیا میں جیسے افغانستان دہشت گردی کا سب سے بڑا مرکز ہو اور دنیا کو اس ملک سے یہ دہشت گردی دنوں کے اندر ختم کرنے کی جلدی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حملہ کرنے سے اقوام متحدہ کی اسمبلی سے جنگ کا اجازت نامہ فوراً مل گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے نیٹو کی شکل میں چالیس سے زائد ممالک افغانستان پر ٹوٹ پڑے۔

" تمام موزلم ٹیرارسٹ نہیں ہیں لیکن تمام ٹیررسٹ موزلم ہیں، چنانچہ میڈیا اور انتظامیہ نے ان کے بدنی نظام کے کمپیوٹر میں نفرت اور شک کا جو ڈیٹا بھر دیا تھا اس کے زیرِ اثر وہ روبوٹس ہو گئے تھے "(۲۶)

مغرب نے اسلام، مسلمان اور دہشت گردی کو آپس میں مدغم کر کے پیش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام دہشت گرد مسلمان کی بجائے تمام مسلمان دہشت گرد قرار پائے۔ شدت پسندی کو مختلف سیاسی اور سماجی پسِ منظر میں جانچنے کی بجائے اسے اسلام کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ نائن الیون کے وقت ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کرنے والوں لوگو کا اسلام سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا امریکہ میں رہنے والے لبرل گوروں کا عیسائیت سے ہے۔ مگر یہاں مغرب نے منافقت سے کام لیتے ہوئے کسی بھی شدت پسند مسلمانوں کے گروہ کو عین اسلامی بتا کر، ان کے خلاف نفرت کو ہوا دینے لگا۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول میں اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ورلڈ ٹریڈ سینٹر، پینٹا گن اور وہائٹ ہاؤس کو متکبر معتبدوں کو مسمار کرنے کی نیت رکھنے والے جو جیٹ طیارے ان کی جانب بڑھتے تھے انہیں اغوا کرنے والے قطعی طور پر شریعت کے پابند مسلمان نہ تھے "(۲۷)

مغرب میں سماجی سطح پر نائن الیون سے پہلے جہادی ڈسکورس کا اتنا زیادہ اثر نہیں پڑا تھا، کیونکہ اسی کی دہائی میں بنایا جانے والا جہادی ڈسکورس مسلم دنیا کے لیے تھا، بالخصوص پاکستان اور افغانستان کے لیے۔ جس کے اثرات سے مغرب بہت حد تک محفوظ رہا۔ مغرب میں اس جہادی ڈسکورس کا اتنا اثر پڑا تھا کہ وہاں روس کے خلاف نفرت اور افغان جنگجوؤں کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے تھے۔ جبکہ نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے ڈسکورس نے نہ صرف مسلم دنیا کو متاثر کیا بلکہ یورپ اور امریکہ بھی اس کے لپیٹ میں بری طرح پھنسے۔ ایک تو وہاں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اسلاموفوبیا نے جنم لیا دوسرا مغرب کی سماجی ساخت میں بھی غیر معمولی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

مغرب میں سب سے پہلے شدت پسندی کو فروغ ملا اور یہ شدت پسندی وہاں کے رہنے والے لاکھوں مسلمانوں کے خلاف تھی۔ اس شدت پسندی میں جب اضافہ ہوا تو دنیا نے دیکھا مسلمانوں کی مسجدوں پر حملے کیے گئے۔ ان حملہ آوروں کا تعلق گو کہ عیسائیت اور یہودیت سے تھا مگر نام نہاد لبرل مغربی ممالک نے اس دہشت گردی کو ذاتی فعل قرار دے کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ جب کہ انہیں دنوں جب پیرس میں ایک نام کے مسلمان نے بے گناہ یورپی لوگوں کا قتل کیا تو پوری دنیا نے اس کو اسلامی دہشت گردی کے طور پر پیش کیا۔ اس کا شخص کا تعلق صرف اسلام سے جوڑا گیا بلکہ اسے اسلام کا نمائندہ فرد بنا کر پیش کیا گیا۔ یہ مغرب کا دوغلا پن تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، ص۵۵

۲۔ نجیب آغا، افغان طالبان کا ظہور، وائس آف کے پی، ۱۸ اگست، ۲۰۲۲

3. https://www.theguardian.com/world/2001/oct/07/afghanistan.terrorism15

4. Steve Coll, Ghost War, p68

5. Ibid, p77

۶۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، ص۶

۷۔ ایضاً

۸۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص۵۰۵

۹۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، ص۱۴

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص۵۰۶

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً، ص۵۰۳

۱۵۔ ایضاً، ص۵۰۶

۱۶۔ ایضاً، ص۵۰۴

۱۷۔ ایضاً، ص۵۰۷

۱۸۔ ایضاً، ص۵۱۱

۱۹۔ ایضاً، ص۵۲۸

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۱۰

۲۱۔ ایضاً، ۵۱۰

۲۲۔ ایضاً، ص۵۰۵

۲۳۔ ایضاً، ص۵۰۷

۲۴۔ ایضاً، ص۵۰۳

۲۵۔ ایضاً، ص۵۰۵

۲۶۔ ایضاً، ص۵۰۶

۲۷۔ ایضاً، ص۵۰۵

کتابیات:

بنیادی مآخذ:

۱۔ مستنصر حسین تاڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶

2. Norman Fairclough, Language and Power, Routledge London, 2013

3. Michel Foucault, The Archaeology of Knowledge, Pantheon Books, 1976

ثانوی مآخذ:

1. Michel Foucault, The Order of Discourse,1981
2. Steve Coll, Ghost War, Penguin Books,2004

۳۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳

3. Steve Coll, Directorate S,2018
4. William Dalrymple, Return of a King: The Battle for Afghanistan, Bloomsbury Publishing, 2013
5. Joe Stephen, The ABC`s of Jihad, Washington Post, 23March, 2002
6. Toby Harden, First Casualty, 2019, p42
7. Paul Burke, Global Jihadist Terrorism, 2007

باب چہارم:

مجموعی جائزہ

انسان کی مادی ترقی اس کی شعوری ترقی کی مرہونِ منت ہے۔ شعوری سطح پر ترقی کرتے ہوئے انسان نے خود کو اپنے سماج اور اس کائنات کو سمجھنے کے لیے مختلف سماجی و سائنسی علوم ایجاد کیے۔ جن میں فلسفہ، تاریخ، سماجیات، زبان و ادب وغیرہ سماجی علوم کہلاتے ہیں جبکہ فزکس، کیمسٹری، کمپیوٹر سائنس بائیولوجی وغیرہ سائنسی علوم کہلاتے ہیں۔ ترقی یافتہ قومیں دونوں علوم کو برابر اہمیت دیتی ہیں۔ جبکہ ہم جیسے ترقی پذیر ممالک میں سائنسی علوم سب زیادہ اہم سمجھے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے بعد روزگار جلدی مل جاتا ہے۔ جبکہ سماجی علوم کم تر سمجھے جاتے ہیں۔

سائنسی علوم کے برعکس سماجی علوم کا زیادہ تر تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے اس لیے یہ علوم انفرادی اور سماجی سطح پر، پیدا ہوانے والی تبدیلیوں میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک ان علوم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف اپنے فرد اور معاشرے کی بہتری کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں، بلکہ بعض مفاد کے حصول کے لیے ترقی پذیر ممالک میں، زبان کو بطور آلہ استعمال کرتے ہیں ان کا سیاسی، سماجی، معاشی اور نظریاتی استحصال کرتے ہوئے نظر بھی آتے ہیں۔

دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ معاشرے میں زبان و ادب کو سماجی ساخت کی تشکیل و ترمیم کے لیے بڑی دانشمندی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ تاکہ بہتر سے بہتر فرد اور سماج تشکیل پاسکے۔ ترقی یافتہ دنیا میں " زبان و ادب " سے دو کام لیے جاتے ہیں۔ زبان کے ذریعے ترسیل فکر میں سے منطقی ابہام دور کیے جاتے ہیں، جبکہ ادب سے معاشرے میں قوت مشاہدہ اور قوت تجزیہ کو مضبوط بنایا جاتا ہے۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں (خاص کر ہمارے تعلیمی اداروں) میں، اردو زبان و ادب میں زبان کو قواعد تک اور ادب کو تاریخ ادب تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پچھلے ستر سالوں میں اردو زبان و ادب سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاسکے۔ جبکہ ریاستی سطح پر " اردو زبان و ادب "، ریاستی پروپیگنڈہ اور مسلکی و لسانی نفرتوں میں استعمال ہونے کی وجہ سے انتہائی سطحی اور مبالغہ آمیز بن چکا ہے۔ جس کی تجدید نو وقت کی اہم ضرورت ہے۔

زیرِ نظر تحقیق میں ہم نے زبان اور سماج کے اسی تعلق کی تفہیم کے لیے مستنصر حسین تارڑ کے ناول " قلعہ جنگی " کو نارمین فیئر کلف کی تھیوری " تنقیدی تجزیہ کلامیہ " کے پس منظر میں کی ہے۔ زبان کو کسی بھی ڈسکورس کے ذریعے بطور طاقت کا ہتھیار استعمال کرنا نہایت آسان اور مؤثر ہے۔ ڈسکورس کے ذریعے ہم کسی بھی معاشرے میں مطلوبہ تبدیلی انتہائی تیزی کے ساتھ پیدا کر سکتے ہیں۔ مشل فوکو نے سب سے پہلے ڈسکورس کا تجزیہ کیا۔ مشل فوکو نے ڈسکورس کے مراحل اور اس کے عناصر پر بحث کی ہے۔ جس کے بعد نارمین فیئر کلف نے ڈسکورس کا تنقیدی جائزہ پیش کیا اور کسی بھی ڈسکورس کت پسِ پردہ مقاصد کھوج کا طریقہِ کار وضع کیا۔

اس طریقہ کار کو نارمین فیئر کلف کا سہہ جہتی ماڈل (Three Dimensional Module) بھی کہتے ہیں۔ فیئر کلف نے سہہ جہتی ماڈل کے ذریعے کسی بھی ڈسکورس کا کم وقت میں انتہائی مؤثر تنقیدہ جائزہ لینے کے اصول بتائے ۔ جس کے مطابق سب سے پہلے کسی بھی ڈسکورس کا بنیادی متن (Text) حاصل کیا جاتا ہے۔ پھر دوسرے مرحلے پر اس متن کی وضاحت کی جاتی ہے کہ یہ متن کہاں سے پیدا ہوا ہے، کن لوگوں نے پیدا کیا ہے اور اس متن سے متاثر ہونے والے لوگ کون ہیں۔ اس کے بعد تیسرے مرحلے پر اس متن کے ذریعے سماجی سطح پر پیدا ہونے والے تبدیلیوں کو دیکھا جاتا ہے۔ جنہیں فیئر کلف سماجی سرگرمیاں کہتا ہے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہم جب بھی سوچتے ہیں کسی نہ کسی زبان میں میں سوچتے ہیں۔ زیادہ تر ہم اپنی مادری زبان میں سوچتے ہیں۔ جبکہ زبان بہت سارے الفاظ کی مرتب شکل ہے۔ ان الفاظ کو سیاسی، سماجی اور جغرافیائی حقیقتیں معینی فراہم کرتی ہیں۔ ان معانی کے کچھ خاص مقاصد ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی فرد یا قوم کی سوچ کو بدلنا چاہتے ہیں تو آپ اس کا ذخیرہ الفاظ(Vocabulary) تبدیل کر دیں۔ کیونکہ انسانی ذہن اپنے پاس موجود ذخیرہ الفاظ کے باہر سوچنے سے قاصر ہے اس لیے، جیسے ہی اس کا ذخیرہ الفاظ تبدیل ہوتا ہے، اس کے سوچنے کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔

افغان جنگ کے دوران، امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مفاد کے پیشِ نظر، ہمیں جہاد، قتال، کافر، مجاہد، غزوہ، اسلامی نظام، تلوار، بندوق، شریعت، شہید، جنت جیسے الفاظ کا ذخیر فراہم کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں دو دہائی کے بعد ایک ایسی نسل تیار ہوئی جو ان الفاظ کے باہر سوچنے سے قاصر ہے۔ جن کے نزدیک کسی کو بھی خدا کے نام اور اس

کے نظام کی ترویج کے لیے قتل کرنا معمولی فعل ہے۔ اسی کی دہائی میں ہماری قوم کا ذخیرہ الفاظ افغان جنگ کے تناظر میں تبدیل کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے تریاسی ہزار بے گناہ لاشیں اٹھائیں۔ جبکہ یہ قیامت ابھی جاری ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناقلعہ جنگی میں دکھایا گیا افغانستان، امریکی پشت پناہی میں روس کے خلاف امریکی مفاد کی جنگ لڑ رہا ہے۔ جس کو اسلام اور کفر کے نظام کی جنگ بنا کر پیش کیا گیا۔ اس جنگ میں امریکی دماغ، عربوں کے ریال اور غریب پاکستانیوں کی جانیں استعمال ہوئیں۔ امریکہ اور سوویت روس کی سرد جنگ کا فیصلہ کن لڑائی، اسلام کے نام پر لڑی گئی۔ جس کے لیے امریکہ اور اس کے اتحادیوں سوویت روس کے خلاف اسلامی جہادی ڈسکورس قائم کیا۔ جب امریکہ اور اس کے اتحادی روس کے شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے روس کے خلاف لڑنے والے ان ہزاروں جنگجوؤں کو افغانستان میں لاوارث چھوڑ دیا۔

یہ وہ لوگ تھے جن کو صرف بندوق اٹھانا آتا تھا، کفر کے فتوے دینا اور بے دریغ قتل کرنا آتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانستان میں یہ لوگ ایک دوسرے کو کافر کہہ کر قتل کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا افغانستان خون ریزہ خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ ان جنگجو امریکہ کے جانے کے بعد تین حصوں میں تقسیم ہوئے تھے۔ ایک گروہ شمالی اتحاد کا تھا جو فارسی بان کہلاتے تھے، دوسرا گروہ طالبان کا تھا جو افغانستان کے پشتو بولنے والے جنگجو تھے اور تیسرا گروہ غیر ملکی جنگجوؤں کا تھا، جنہیں مقامی افغانوں میں "عرب مجاہدین" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

شمالی اتحاد والے دوستم اور احمد شاہ مسعود کی زیرِ قیادت، روس کی پشت پناہی میں پشتونوں اور عرب جنگجوؤں کے خلف برسرِپیکار تھے۔ جبکہ طالبان اور القاعدہ کے نظریات میں ایک واضح فرق یہ تھا کہ طالبان یا پشتون جنگجو اس جہاد کو افغانستان کی سرزمین تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسلام یا اسلامی جہادی آئیڈیالوجی کو دنیا بھر میں رائج کرنے کی بات نہیں کرتے تھے۔ جبکہ القاعدہ جہاد کا دائرہ کار عراق، شام، فلسطین، افریقہ، اسرائیل اور امریکہ تک پھیلانا چاہتے تھے۔

افغانستان میں خانہ جنگی جب اپنے عروج پر پہنچی تو، نائن الیون کا سانحہ ہو گیا۔ جس کا الزام افغانستان میں موجود القاعدہ پر لگایا۔ القاعدہ یعنی افغانستان میں موجود غیر ملکی جنگجو، جن میں زیادہ تر عرب کے لوگ شامل تھے۔ جب امریکہ نے القاعدہ کے رہنما اسامہ بن لادن کی گرفتاری کا مطالبہ کیا تو طالبان حکومت کے لیڈر ملا عمر نے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ

سے روس کے بعد امریکہ نے ایک بار پھر افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں پاکستان امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بنا۔ جس کی وجہ سے جن لوگوں کے پاکستان نے سوویت جارحیت کے خلاف سپورٹ کیا تھا وہ تمام پاکستان کے خلاف ہو گے۔ وہ تمام جنگجو جنہوں نے بیس سال قبل، امریکی پشت پناہی میں سوویت روس کو شکست دے کر مجاہدین کہلائے، واب دہشت گرد کہلانے لگے۔

گیارہ ستمبر کے بعد ڈسکورس، جہاد سے دہشت گردی کی طرف شفٹ ہوا تو، امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے سب سے پہلے عالمی سطح پر ان جنگوؤں کے پہلے سے موجود ذخیرہ الفاظ تبدیل کیا۔ پھر ہمیں جہاد، قتال، کافر، مجاہد، غزوہ، اسلامی نظام، تلوار، بندوق، شریعت، شہید، جنت کی بجائے، دہشت گردی، جہاد، اسلام ازم، اسلامی دہشت گردی، مذہبی شدت پسندی، مذہبی دہشت گردی کے الفاظ مغربی دنیا میں کثرت سے استعمال کیے گئے۔ جس کے بعد دہشت گردی کے ڈسکورس کی مضبوطی کے لیے اسلام اور دہشت گردی کو زبردستی جوڑ کر دکھایا گیا۔ یہ ڈسکورس اتنا مضبوط تھا کہ مغرب کے علاوہ مشرق میں بھی لوگ اسلام اور دہشت گردی میں فرق کرنے سے قاصر رہے۔

مغرب میں رہنے والے مسلمان اپنی اسلامی شناخت سے دستبردار ہونے لگے جبکہ مشرق میں لوگ اس ڈسکورس کے رد عمل میں سیکولرازم اور لبرل ازم کی طرف رجوع کرنے لگے۔ حکومتی سطح پر کسی ملک نے بھی، اپنی نظریات شناخت کے انہدام پر، اس ڈسکورس کے باہر جا کر سوچنے کی زحمت گوارا نہیں۔

نظریاتی خلاء کے نتیجے میں مشرق انفرادی اور سماجی سطح پر کھوکھلے پن کا شکار ہو گیا۔ جہاں سماجی و اخلاقی اقدار زوال پذیر ہونے لگیں۔ پھر یہاں وہ جرائم بھی ہوتے دیکھے، جن کے بارے دو سال پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں کی سماجی ساخت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔

سماجی ساخت کسی بھی سماج کو وہ بنیادیں جس کی بنا پر کوئی بھی قوم اپنی منزل، معنی اور مقاصد وضع کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے سماج میں لاشعوری بنیادوں پر معلومات کا تبادلہ ہوتا ہے اور لوگوں میں رابطہ قائم رہتا ہے اور سماجی سطح پر باہمی تواون بڑھتا ہے۔ جنگوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جنگیں سماجی ساخت کو تباہ کر دیتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں سماجی انتشار جنم لیتا ہے۔ جہاں سب سے پہلے کسی قوم میں مقصدیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ایک ایسی نسل

جنم لیتی ہے، جس کا نہ اپنا کوئی نظریہ ہوتا ہے، نہ اپنی ثقافت ہوتی ہے اور نہ کوئی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔اس المیے کی قریب ترین مثال افغانستان اور پاکستان ہیں۔

تحقیقی نتائج:

مستنصر حسین تارڑ کے ناول قلعہ جنگی میں موجود سیاسی ڈسکورس کے تنقیدی جائزے سے جو نتائج سامنے آئے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ اردو ادب میں تخلیقی سطح پر نئے مسائل کو پیش کیا جارہا ہے، جن کے تنقیدی مطالعے سے ہم جدید لسانی مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔

۲۔ سماجی بنت اور شکست و ریخت میں زبان ایک اہم اور انتہائی مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔

۳۔ قلعہ جنگی میں زبان کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے، عالمی طاقتوں کے بنائے گئے ڈسکورس کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ افغان جنگ دراصل امریکہ اور سوویت روس میں جاری سرد جنگ کا فیصلہ کن جنگ تھی۔ جس کو اسلام کی بقا کی جنگ بنا کر پیش کیا گیا تھا۔

۵۔ پاکستان اور افغانستان میں مذہبی شدت پسندی ن ہ تو یہاں کی سماجی پیداوار ہیں اور نہ ہی اسلام کی وجہ سے ہیں، بلکہ مغرب ممالک نے اپنے مفاد کے حصول کے لیے پیدا کی ہے۔

۶۔ افغانستان میں جنگ کے دوران، بنائے گئے جہادی ڈسکورس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ امریکہ کا سوویت روس کے خلاکاف جنگ کی حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔

۷۔ نائن الیون کے بعد، عالمی سطح پر بنائے گئے دہشت گردی کے ڈسکورس کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اسے امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان اور دوسرے مسلمان ملکوں پر حملہ کرنے کی خاطر ترتیب دیا ہے۔

۸۔ عالمی سطح پر "اسلاموفوبیا" بھی اس ڈسکورس کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

سفارشات:

۱۔ جدید دنیا میں زبان کو سماجی سطح پر بطور طاقت کے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اردو زبان میں بھی قواعد اور گرامر کے علاوہ اس کے سماجی مطالعے کو فروغ دیا جانا چاہیے۔

۲۔ اردو ادب کا جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ تاکہ میعاری ادب کی تخلیق میں رکاوٹیں دور ہو سکیں۔

۳۔ جامعات کی سطح پر، اردو زبان و ادب کو "اردو قواعد" اور "اردو ادبی تاریخ" تک محدود نہ رکھا جائے، جدید تنقیدی مباحث اور ان کا سماجی سطح پر اطلاق کی روایت کی فروغ دیا جائے۔

۴۔ اردو زبان و ادب میں سیاسی تبدیلیوں پر بے پناہ مواد موجود ہے۔ جس کا سیاسی تاریخ کے تناظر میں جائزہ لیا جانا چاہیے۔

۵۔ اردو زبان و ادب نے پاکستانی سماج کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کا سماجی سطح پر ہونے والی نشو و نما کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، تاکہ بہتر سماج کی تشکیل کی راہ ہموار ہو سکے۔

کتابیات:

بنیادی مآخذ:

۱۔ مستنصر حسین تاڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶

۲۔ نارمین فیئر کلف، لینگوئج اینڈ پاوور، روٹ لیج، لندن، ۲۰۱۳

۳۔ مشل فوکو، آرکیالوجی آف نالج، پینتھیون بکس، نیویارک، ۱۹۷۶

ثانوی مآخذ:

۱۔ مشل فوکو، دا آرڈر آف ڈسکورس، ڈسکورس: سٹڈی ان کلچرل پالیٹکس، یونیورسٹی آف وٹر سینڈ ساؤتھ افریقہ ۱۹۹۷

۲۔ سٹیو کول، گھوسٹ وار، پینگوئن بکس نیویارک، ۲۰۰۴

۳۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳

۴۔ سٹیو کول، دائریکٹوریٹ ایس، پینگوئن رینڈم ہاؤس یو کے، ۲۰۱۸

۵. ولیم دالریمپل، ریٹرن آف کنگ، بلومز بری پبلشنگ، فروری ۲۰۱۳

۶۔ مشل ڈبلیو ایس، ڈی کوڈنگ القاعدہ، کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳

۷۔ الیگزینڈر ملی گرو، دی ٹریولر، دی جارج واشنگٹن یونیورسٹی، فروری ۲۰۰۸

ویب لنکس:

1. https://www.tandfonline.com/doi/abs/10.1080/0159630970180302
2. https://www.washingtonpost.com/archive/politics/2002/03/23/from-us-the-abcs-of-jihad/d079075a-3ed3-4030-9a96-0d48f6355e54/
3. https://www.voiceofkp.pk/author/najeeb-agha/
4. https://www.usip.org/publications/2010/05/why-youth-join-al-qaeda

ضمیمہ

فرہنگ مصطلحات:

کلامیہ	Discourse
تنقیدی تجزیہ کلامیہ	Critical Discourse analysis
سماجی سرگرمیاں	Social Practices
متن	Text
متنی تجزیہ	Text Analysis
متنی ذرائع پیداوار	Text Production
متنی تصرف	Text Consumption
علمی ڈھانچہ	Body of Knowledge
نظاماتی تفاعلی لسانیات	Systematic Functioinal Linguistics
سہہ جہتی ماڈل	Three Dimensional Module
مطالعاتی مقاصد	Objects of Study
مذہبی متون	Religious Text
کلامیاتی مقاصد	Objects of Dicsourse